تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

سلسلہ نمبر ۲۴ شعبان ۱۴۰۸ھ مارچ ۱۹۸۸ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

نفاذِ شریعت کی راہ کا سنگِ گراں ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ مائدہ (۴) ——— خالد مسعود ۷

تدبرِ حدیث

نمازوں کے اوقات (۲) ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۴

حکمتِ قرآن

نظامِ نبوّت

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں ——— امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۲۶

افاداتِ فراہی

حکمتِ قرآن (۳)

شکرِ نعمت کا نتیجہ ——— حکمت ——— خالد مسعود ۳۸

مقالات

علم اور ذرائع علم ——— امین احسن اصلاحی ۴۵

مجلسِ ترتیب

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر: ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی
سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع: المطبعة العربية۔ لاہور

قیمت: =/۵ روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تذکرہ وتبصرہ ———— خالد مسعود

نفاذِ شریعت کی راہ کا سنگِ گراں

پچھلے سال تک متحدہ شریعت محاذ کافی سرگرم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں شامل جماعتیں نفاذِ شریعت کے میدان میں کچھ کامیابی حاصل کرکے ہی دم لیں گی۔ ان کے لیڈروں کے بیانات کی گھن گرج اسلامی انقلاب کی آمد آمد کی منادی کر رہی تھی۔ خیال تھا کہ اگر حکومت نے اس وقت مجوزہ شریعت بل کی راہ میں روڑے اٹکائے تو ایک طرف ارکانِ پارلیمنٹ دھڑا دھڑ مستعفی ہونے لگیں گے اور دوسری طرف اسلامی انقلاب کے علمبردار اپنے کارکنوں کے جلوس میں شہروں کی سڑکوں پر پکٹنگ کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم پر دینی جماعتوں کا اشتراکِ عمل اور جماعتی مصلحتوں سے بلند ہوکر امت کی خدمت کا عزم حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے گا اور یوں نفاذِ شریعت کی راہ ہموار ہوجائے گی لیکن ـــ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! چشمِ فلک نے یہ دیکھا کہ جب وقتِ قیام آیا تو رہنما سجدوں میں گر گئے۔ بعض نے بیرونِ ملک چلے جانے میں عافیت سمجھی۔ دوسرے اپنے جماعتی مصالح کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔ محاذ کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ شریعت بل ذہنوں سے اترنے لگا۔ اب قرائن بتاتے ہیں کہ متحدہ محاذ میں اتحاد نام کی چیز بھی معرضِ خطر میں ہے اور محاذ کے ایک رکنِ رکین ڈاکٹر اسرار احمد نے تو شریعت بل کا مرثیہ بھی لکھ دیا ہے۔

شریعت بل میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ اس کے مجوزین شریعت سے قرآن وسنت کو مراد لیتے ہیں اور ان سے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے سنتِ خلفائے راشدین، تعاملِ صحابہ، اجماعِ امت اور مسلّم فقہائے اسلام کی تشریحات سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ فقہی اختلافات کو نفاذِ شریعت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن یہ تاثر بالکل مصنوعی تھا۔ ہم نے تدبر کے شمارہ ۱۹ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ علماء کے ذہنوں میں حقیقی وسعت پیدا ہوئے بغیر دلوں میں بُعد کے ساتھ اتحاد واتفاق کی فضا زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ یہ اندیشہ اب حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے۔ البلاغ میں جناب محمد تقی عثمانی یہ

فرما چکے ہیں کہ بنیادی طور پر شریعت کی اس تعبیر کو اختیار کیے بغیر چارہ نہیں جو ملک کے اکثریتی مکتبِ فکر کی تعبیر ہے اور عبادات، نکاح وطلاق اور وراثت جیسے امور میں ہر مسلم مکتبِ فکر کے لیے الگ قانون سازی کی بات ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد فکر کی ارتقا کے مراحل طے کرنے کے بعد اس وقت اسی نقطہ نظر کے حامل ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے مخدوم مولانا حامد میاں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ جس طرح سعودی عرب میں فقہ حنبلی نافذ ہے اور حکومتِ ایران نے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کا مسلک فقہ جعفری ہے، اسی طرح حکومتِ پاکستان بھی اپنے فقہ حنفی پر ہونے کا اعلان کرے۔ ۴ مارچ کو جمعیت العلماء اسلام (درخواستی گروپ) نے لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں نفاذِ شریعت کا مطالبہ دہرایا گیا۔ تقاریر میں جو بات نمایاں رہی وہ ملک میں فتاویٰ عالمگیری کے نفاذ کا مطالبہ تھا اور شریعت کے حق میں جس تحریک کے چلانے کا حکومت کو نوٹس دیا گیا وہ اب تنہا جمعیت چلانا چاہتی ہے۔ اہل حدیث اس بدلتی ہوئی فضا پر بہت جز بز ہو رہے ہیں اور جناب وزیر اعظم کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ صرف اس شریعت کو نافذ کریں گے جو سب فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو گی۔ دوسرے الفاظ میں جب تک فرقے متحد نہیں ہو جاتے موجودہ نظام برقرار رہے گا۔ شاید ان کا خیال یہ ہے کہ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں نفاذِ شریعت کی راہ میں متعدد مشکلات حائل ہیں۔ حکمران طبقہ اس ذمہ داری سے ہمیشہ جان چھڑاتا رہا ہے۔ یہ طبقہ معاشرے کے جس حصے سے آتا ہے اس میں شاید ہی کبھی یہ موضوع زیرِ بحث آتا ہو کہ ہماری زندگیاں شریعت کے دائرے میں آنی چاہئیں یا ملک کے نظام کو اس نظریے کے مطابق تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ دین و شریعت کے مسائل کو یہ لوگ عملی زندگی سے الگ رکھتے ہیں اور ذہنی طور پر سیکولر ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لوگ عوامی تائید سے منتخب ہو کر ایوانِ حکومت میں پہنچتے ہیں اس لیے ان کا کردار فی الجملہ وہی ہے جو ان کے منتخب کرنے والوں کا ہے۔ اگر عوام کے اندر دینی حس بیدار ہوتی تو وہ اپنے نمائندوں کے اندر بھی دین کی جھلک دیکھنا چاہتے اور جب وہ کرسیِ اقتدار پر ہوتے تو ان کو ان کی دینی ذمہ داری یاد دلاتے رہتے۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ بس اتنا ہے کہ حکومت اسلام کا نعرہ تو برابر لگاتی رہتی ہے لیکن عملاً اس کی خاطر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔ لہٰذا نفاذِ شریعت، جب بھی ممکن ہوا، اس کی مصلحتوں کے علی الرغم ہی ممکن ہو گا۔

جہاں تک علمائے کرام کا تعلق ہے وہ منصبی طور پر نفاذِ شریعت کے مطالبہ کا حق رکھتے ہیں اور انہی سے اس بات کی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ نفاذِ شریعت کی راہ ہموار کرنے میں معاون ہوں گے۔ لیکن بدقسمتی سے

ان کا رویہ بھی ایسا ہے جس میں یہ کام نعرہ بازی تک ہی محدود رہتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ ایک علماء کی تفرقہ بازی اور دوسری عملی ذمہ داری کے ادراک کا فقدان۔

تفرقہ بازی کے نتیجہ میں نہ صرف علماء خود مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اُمت کو بھی انتشار کا شکار کیا ہوا ہے۔ انھوں نے فقہی مسلک کو اصل دین سمجھ لیا ہے اور اس کی خاطر قرآن و سنت کے نصوص تک کو قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اتحادِ امت کی کوئی کوشش ہوتی ہے تو وہ اپنے اپنے مسلک کا جھنڈا بلند کر کے میدان میں آ جاتے ہیں اور اس کی سرنگونی کو شریعت کی سرنگونی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا تفرقہ بازی کی ممانعت کا دو ٹوک حکم تو انہیں کبھی یاد نہیں آیا لیکن اس کو جواز مہیا کرنے کے لیے ایک بے بنیاد حدیث —— اختلافُ امتی رحمةٌ (میری اُمت کا اختلاف باعثِ رحمت ہے) —— بڑے شد و مد سے پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دشمنِ اسلام کی گھڑی ہوئی ہے۔ ملا علی قاری نے اسے الموضوعات الکبریٰ میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بے سند قول ہے۔

ہمارے نزدیک ہر فقہ، خواہ وہ حنفی ہو یا مالکی، امام شافعی کی ہو یا امام احمد کی، قرآن و سُنت کے چشمۂ صافی سے پھوٹی ہے اور امت نے اسے سندِ قبول عطا کی ہے۔ دین ان فقہوں میں سے کسی ایک میں محصور نہیں ہے بلکہ ان سب میں اس کی نمود ہے۔ چونکہ ہر فقہ انسانی کوشش سے مرتب ہوئی ہے اور انسانی کوشش ناقص ہوتی ہے اس لیے فی الجملہ ہر فقہ درست ہونے کے باوجود کمزوری کے بعض پہلو بھی رکھتی ہے اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تمام فقہوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہر معاملے میں وہ بات متعین کرنے کی کوشش کی جائے جس کے حق میں قرآن و سُنت کے دلائل زیادہ ہوں۔ ہمارے علماء اگر اس وسعتِ نظر کا مظاہرہ کریں تو ان کی صفوں میں وہ اتحاد پیدا ہو سکتا ہے جس پر آسمان کے فرشتے بھی ان کو ہدیۂ تبریک پیش کریں گے۔ اس کے بعد ان کے مطالبۂ نفاذِ شریعت میں ایسی قوت پیدا ہو جائے گی کہ حکومت آسانی سے اس سے جان نہیں چھڑا سکے گی۔

علماء کے عملی ذمہ داری کے ادراک سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ ان دشواریوں کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیں جو نفاذِ شریعت کی راہ میں حائل ہیں اور عملی نوعیت کی ہیں۔ اور ان کو روکنے کے لیے وہ کام کریں جو ان کے کرنے کا ہے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ آپ با ایں علم و تقویٰ اپنے لیے تو اجتہاد کا دروازہ بند سمجھیں لیکن ملک کے ہر مجسٹریٹ اور سول جج کو معاذ بن جبل، ابو الدرداء، سعید بن المسیب اور قاضی شریح کی مسند پر بٹھا کر چاہیں کہ وہ اجتہاد کرے۔ ججوں کے بس میں یہ کام اس وقت ہو گا جب آپ کچھ ایسی بنیادی

دستاویزات ان کے حوالے کریں گے جن کی دفعات کے حوالے سے وہ فیصلے دے سکیں۔ اس کے لیے قلیل المیعاد منصوبہ یہ ہو سکتا ہے کہ ترکی کے مجلہ احکام عدلیہ، عالمگیری اور مختلف اسلامی ممالک میں رائج شرعی احکام کے مجموعوں سے مدد لی جائے۔ ان میں کسی ممکنہ نزاع سے بچنے کے لیے تمام دینی جماعتوں کے نمائندہ اکابر کا ایک بورڈ ان مجموعوں کا جائزہ لے۔ اختلاف کی صورت میں وہ دلائل کی روشنی میں اُس بات کو اختیار کریں جو قرآن و سنت سے اوفق ہو۔ اس کے اختیار کرنے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کریں۔ اجتہاد کا دروازہ اس مقصد کے لیے کھولنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ اگر ججوں کے بجائے یہ آپ کے ہاتھوں کھلے تو یہ زیادہ مبارک ہو گا۔ آخر جن لوگوں نے پہلے احکام کی تدوین کی ہے وہ بھی آپ جیسے علما ہی تھے۔ اگر جذبہ صادق اور نیتیں نیک ہوں تو یہ کام نہایت قلیل مدت میں انجام دیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد حکومت پر زور دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس متفق علیہ مجموعۂ احکام کے نفاذ کے لیے اقدامات کرے۔ ان کے اس مطالبہ کو نظر انداز کرنا حکومت کے لیے آسان نہ ہو گا۔ اگر علما اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے ایک سیکولر ذہن کی حکومت سے قادیانی مسئلہ کا مذہبی نوعیت کا فیصلہ کروا سکتے ہیں تو نفاذِ شریعت کے لیے وہ اسی طرح کی فضائیں کیوں قائم نہیں کرتے؟ ہمیں خدشہ ہے کہ ذمہ داریوں کے ادراک اور ان کی ادائگی کے اقدام کے بغیر ہمارے ہاں شریعت بل جیسے لیپے ہوتے رہیں گے اور احکام شریعت کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اور اس کی ذمہ داری محض حکومت پر نہ ہو گی بلکہ علمائے کرام خود اس کے ذمہ دار ہوں گے۔

اطلاع

تدبر کے نئے خریدار عموماً یہ تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں اب تک شائع ہونے والے تمام پرچے مہیا کیے جائیں۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر ادارہ نے تدبر کے شمارہ (۱ تا ۱۰) اور (۱۱ تا ۲۰) کی جلد بندی کرائی ہے۔ قارئین جو ان مجلد شماروں کو حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ پچاس روپے فی جلد کے حساب سے رقم بھیج کر رسالہ منگوا سکتے ہیں۔

(ادارہ)

تفسیر سورۂ مائدہ (۴)

اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، اور نہ کفار کو۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔[۴۹] یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو کہ اے اہل کتاب، تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ کہو کیا میں تمہیں باعتبارِ انجام اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برے لوگوں کا پتہ دوں؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور[۵۰] بنائے اور جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔ ٦٠

---

[۴۹] یہودی اشرار جس طرح مجلسِ نبوی میں بدتمیزیاں کرتے تھے اسی طرح ان کے اراذل اذان کی بھی نقلیں کرتے اور اس پر ہنستے ہنساتے۔ اذان اللہ کی بندگی کی دعوت ہے۔ اس کا مذاق اڑانا خود خدا کی تحقیر اور اس کا مذاق اڑانے کے ہم معنی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے جذبۂ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ یہ لوگ تو تمہارے شعائرِ دین کو کھیل تماشہ بناتے ہیں۔ حیف ہے اگر تم ان کو اپنا دوست بناؤ۔

[۵۰] انسان اپنی مادی خلقت کے اعتبار سے گوشت پوست سے بنا ہوا ایک حیوان ہی ہے۔ اس کو انسانیت کا جمال شعلۂ یزدانی سے حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عنایت فرمایا۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ شعلہ بجھ جائے اور اس کی خواہش اور عمل کے درمیان سے عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جائے اور وہ یکسر اپنی خواہش کا غلام بن جائے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں رہ جاتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہونے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہو کے رہتا ہے۔ حقیقت بین نگاہیں یہ اندازہ کر لیتی ہیں کہ فلاں صورت کے اندر بندر چھپا ہوا ہے یا خنزیر۔

اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ نکلے ہیں اور اللہ خوب واقف ہے اس چیز سے جس کو وہ چھپا رہے ہیں ۝ تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں۔ کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں[۵۱] ۝ ان کے علما اور فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں! کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں ۝ ۶۳

اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں[۵۲] اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو۔ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی ہے[۵۳]۔ اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دے گا[۵۴]۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۝ ۶۴

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہ جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے ۝ اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم کرتے[۵۵] جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے

---

۵۱ یعنی ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہونا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو بہت ہی برا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔

۵۲ شعائر دین کے ساتھ مذاق کے علاوہ یہ یہود کی گستاخی کا ذکر ہے۔ وہ قرآن کی انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت کے جواب میں کہتے کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں بہت غریب ہو رہے ہیں، اور انہیں بندوں سے قرض مانگنے کی نوبت آگئی ہے۔ اس گستاخی پر یہود کو پھٹکارا ہے۔

۵۳ یہاں اس گستاخانہ رویہ کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہود اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ قرآن کا ملنا ان کو قوموں کی اس امامت و سیادت کا بھی مستحق بنا رہا ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے۔ اس حسد نے ان کو خدا کا بھی باغی بنا دیا اور اس کے سبب سے ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف بھی ہمیشہ کے لیے عداوت اور کینہ کا بیج پڑ گیا۔

۵۴ یہاں یہ یاد رہے کہ مسلمانوں پر کفار کے حملوں میں یہود کی سازش اور انگیخت کو ضرور دخل رہا۔

۵۵ قائم کرنے سے مراد زندگی کے معاملات سے ان کا تعلق قائم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب اس لیے عطا فرماتا

اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے خدا کا رزق و فضل پاتے۔ ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے لیکن زیادہ ان میں ایسے ہیں جن کے عمل بہت برے ہیں ۝ ۶۶

اے رسول، تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا[۵۶]۔ اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا ۝ ۶۷

کہہ دو اے اہل کتاب، تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے[۵۷]۔ لیکن وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر میں اضافہ کرے گی تو تم اس کافر قوم پر غم نہ کرو ۝ بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور صابئی اور نصاریٰ، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۵۸] ۝ ۶۹

ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی تو ایک گروہ کی انہوں نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ۝ اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی، پس اندھے بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے ان پر

ہے کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق بسر کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو خواہ زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جائے، یہ کھلا نقض میثاق اور شریعت الٰہی کا ہدم ہے۔

۵۶ یعنی اگر مخاطبوں کی مرو رعایت یا ان کے متوقع ردعمل کے اندیشہ سے خدا کا پیغام پہنچانے میں کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ کوتاہی عین اس فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی جس کی ادائیگی ہی کے لیے اللہ کسی کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے۔ اہل کتاب کی مخالفت و عداوت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان شیاطین کے ہر شر سے خدا تمہیں محفوظ رکھے گا۔

۵۷ مراد قرآن مجید ہے۔

۵۸ یعنی خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ و مرتبہ کسی گروہ کے ساتھ نسبت کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز حاصل نہ ہو تو ہر چند کوئی شخص مسلمانوں ہی کے گروہ سے وابستہ ہونے کا مدعی ہو، خدا کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

رحمت کی نگاہ کی، پھر ان میں سے بہت سے اندھے بہرے بن گئے[۵۹]، اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں ۷۱
بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے[۶۰] اور حال یہ ہے کہ مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل ! اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا ۷۲
ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود[۶۱] اور اگر یہ باز نہ آئے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں تو ان میں سے جنہوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا ۷۳
کیا یہ اللہ کی طرف رجوع اور اس سے مغفرت طلب نہیں کرتے ؟ اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے ۷۴
مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو، کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر رہے ہیں[۶۲]

---

۵۹ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے کہ وہ لازماً ہر جرم کی سزا فوراً ہی دے۔ بلکہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کر لیں اگر چاہیں، ورنہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ بنی اسرائیل اس ڈھیل سے اندھے بہرے بن گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان کو پکڑا۔ پھر انہوں نے توبہ و اصلاح کی تو اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی لیکن اس کے بعد وہ پھر اندھے بہرے بن گئے۔ چنانچہ آیت میں اندھے بہرے بننے کا دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

۶۰ یہود کے بعد اب یہ نصاریٰ کے کفر و شرک کا بیان ہے تاکہ ان کی حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ دین کے پلڑے میں ان کا کیا وزن ہے۔ "خدا تو یہی مسیح بن مریم ہے" تعبیر ہے نصاریٰ کے عقیدۂ حلول کی جس کے مطابق خدا مسیح کے جسم میں تھا۔ فرمایا نصاریٰ کا اس طرح کا عقیدہ صریح کفر ہے۔

۶۱ یہ تعبیر ہے عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی۔ فرمایا کہ کائنات کا خالق و مالک تو اللہ وحدہٗ لاشریک ہے لیکن ان ظالموں نے اس کی خدائی کو تین میں تقسیم کر کے اس کو تین کے تیسرے کا درجہ دے رکھا ہے۔ آگے کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگرچہ عقیدۂ تثلیث کفر ہے لیکن ان کے لیے توبہ و اصلاح کا دروازہ کھلا ہے۔

۶۲ یعنی مسیح ابن مریم کو انہوں نے خدا بنا کے رکھ دیا حالانکہ وہ اپنے مزاج، کردار، دعوت، عبدیت، خشیت اور بشریت ہر چیز میں دوسرے رسولوں کے مشابہ تھے۔ ان کی ماں خدا کی نہایت وفادار اور صداقت شعار بندی تھیں۔ اور یہ دونوں ماں بیٹا اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے اسی طرح غذا اور پانی کے محتاج تھے۔ جس طرح ہر انسان اس کا محتاج ہوتا ہے۔

پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں ۷۵
کہو کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے لیے کسی نقصان اور نفع پر اختیار نہیں رکھتی اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ ہی ہے ۷۶
کہہ دو، اے اہلِ کتاب ! اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو[۶۳]، اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہِ راست سے بھٹک گئے[۶۴] ۷۷
بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے[۶۵] ۷۸
جس برائی کو اختیار کر لیتے اس سے باز نہ آتے۔ نہایت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے ۷۹
تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ نہایت برا توشہ ہے جو انہوں نے اپنے لیے بھیجا[۶۶] کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے ۸۰
اگر یہ اللہ پر، نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا۔ ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان کفار کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے تو اکثر نافرمان ہیں ۸۱

---

۶۳ غلو کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ (دیکھیے نساء آیت ۱۷۱) یہ غلو ہی کا کرشمہ ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کو رسول سے خدا بنا ڈالا، پھر ان کی ماں اور روح القدس کو بھی خدائی میں شریک کر دیا۔

۶۴ یہ اشارہ پال اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے جنہوں نے نصرانیت کا حلیہ بگاڑا اور تثلیث کا ڈھونگ رچایا۔ فرمایا کہ تم جس چیز کو دین بنائے بیٹھے ہو یہ تمہارے اپنے گھر کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بت پرست قوموں سے درآمد کردہ چیز ہے جو تم پر لاد دی گئی ہے۔

۶۵ بنی اسرائیل پر اس لعنت کے لیے ملاحظہ ہو زبور ۱۲ : ۱-۳ ، ۲۸ : ۳-۶ ، ۴۰ : ۱۰-۱۴ ، ۵۰ : ۱۶-۲۲ ، ۶۸ : ۱-۴ ، ۱۰۹ ، ۱۴۰ : ۶-۱۱ اور انجیل متی ۲۳ : ۱۳-۳۹۔ حقیقت میں حضرت داؤد سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی نے بنی اسرائیل پر لعنت کی ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خدا اور اس کی شریعت اور بندوں کے تمام حقوق ان کے ہاتھوں بری طرح پامال ہوئے اور نبیوں اور راست بازوں کی کسی اصلاح کی کوشش کو وہ خاطر میں نہ لائے۔

۶۶ مطلب یہ کہ یہود کو دعویٰ تو اپنی برتری اور تقدس کا ہے لیکن دیکھو وہ کس گڑھے میں جا گرے ہیں اور اسلام دشمنی کے جوش میں انہوں نے کن لوگوں سے یاری گانٹھی ہے۔ مشرکوں سے یاری ایمانی و اخلاقی انحطاط کی آخری حد ہے۔

تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہلِ ایمان کی دوستی سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں[۶۷]۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں۔ اور یہ تکبر نہیں کرتے ۝ اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں[۶۸] لکھ ۝ اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا، ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا ۝ تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے ۝ اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں ۝ ۸۶

اے ایمان[۶۹] والو، ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ، جو خدا نے تمہارے لیے جائز کی ہیں اور نہ حدود سے تجاوز کرو[۷۰]۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۝ خدا نے تمہیں جو حلال و

---

[۶۷] یہاں نصاریٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو شمعون صفا کے پیرو تھے۔ پال کی بدعات سے بچے ہوئے تھے اور اپنے کو نصاریٰ کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے جبکہ پال کے متبعین کی نظروں میں یہ نسبت حقیر تھی۔ نصاریٰ نے قرآن مجید کا اس طرح والہانہ خیر مقدم کیا گویا وہ مدتوں سے اس کے لیے سراپا شوق و انتظار تھے۔

[۶۸] "گواہی دینے والوں میں لکھ" کہنے کا ایک خاص موقع ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب یہود پر اتمام حجت کیا تو ان سے رخصت ہونے سے قبل فرمایا کہ "دیکھو، تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے کیوں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے"۔ آپ کے اس قول میں یہ خبر تھی کہ اب آخری نبی کی آمد تک دوسرا کوئی نبی نہ آئے گا اور آخری نبی کے حق میں گواہی اور ان پر ایمان ہی کے نتیجہ میں اب دنیا و آخرت کی تمام سرفرازیاں حاصل ہو سکیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے نصاریٰ نے اس قدیم عہد کا اقرار کیا جس کے وہ پچھلے نبیوں کی امانتوں اور ان کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پابند تھے۔

[۶۹] یہاں سے آگے آخر سورہ تک خاتمہ کی آیات ہیں جن میں بعض وضاحتیں سورہ کے ان احکام و مضامین کے بارے میں ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔

[۷۰] یہ جامع اور اصولی بات فرمائی کہ خدا کی شریعت نے جو چیز جائز ٹھہرائی ہے اس کو نہ تو حرام قرار

طیب چیزیں بخشی ہیں ان کو برتو اور اس سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو ۝ تمہاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں ان پر تو اللہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ کیا ہے ان پر مواخذہ[۷۱] کرے گا۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھ دے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اس کے شکرگزار رہو ۝ ۸۹

دو اور نہ جن چیزوں سے روکا ہے ان کو جائز بناؤ۔ اپنی مرضی سے تحریم و تحلیل حاکمیتِ الٰہی کے حدود میں مداخلت اور نقضِ میثاق کا ایک نہایت وسیع دروازہ ہے۔ حرام کو حلال کرنے کی راہ زیادہ تر خواہشات نفس کی تحریک سے کھلتی ہے لیکن حلال کو حرام ٹھہرانے کے معاملہ میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو رہا ہے۔

[۷۱] قسم کا یہاں ذکر اشیاء کی تحریم و تحلیل کے تعلق سے ہے۔ قسم قول و قرار، شہادت اور ہر عہد و پیمان کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے وہ قسم قابل مواخذہ ہے جس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہو یا وہ شریعت کی تحریم و تحلیل پر اثر انداز ہو۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملہ میں نہایت محتاط رہے۔

نمازوں کے اوقات (۲)

مؤطا امام مالک کی کتاب وقوت الصلوٰۃ کی احادیث

۵- وحدثنی عن مالک عن زید بن اسلم وعن بسر بن سعید و عن الاعرج - کلّھم یحدثونه عن ابی ھریرة اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصُّبْحِ، قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ؛ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ، قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ ۔

□ ... حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے صبح کی نماز میں سے طلوعِ آفتاب سے پہلے، ایک رکعت بھی پالی اس نے صبح کی نماز پالی؛ اور اگر کسی شخص نے عصر کی نماز کی ایک رکعت بھی غروبِ آفتاب سے پہلے پالی تو اس کو عصر کی نماز مل گئی۔

یہ روایت صحیح بخاری —— کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۲۸ —— اور صحیح مسلم —— کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب ۳۰ —— میں بھی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو نمازِ فجر کی ایک رکعت طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے یا نمازِ عصر کی ایک رکعت غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے ادا کرنے کا وقت مل جائے، تو ادائیگی فرض کی حد تک یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی نماز وقت کے اندر ہو گئی۔ نماز فوت شدہ نہیں قرار دی جائے گی۔ فرض کیجیے آپ صبح دیر سے بیدار ہوئے۔ جلدی جلدی وضو کر کے آپ نے نمازِ فجر پڑھنا شروع کی، لیکن ایک ہی رکعت پڑھ پائے تھے کہ سورج نکل آیا؛ یا امام صاحب نے جماعت آخر وقت میں کرائی اور طول قراءت کی

وجہ سے ایک رکعت تو نماز کے وقت کے اندر ہوئی اور دوسری رکعت کی ادائیگی سے پہلے سورج نکل آیا تو ان صورتوں میں آپ کی نماز ہو جائے گی۔

یہ روایت صرف نماز ادا ہو جانے کی خبر دیتی ہے، رہا ثواب وغیرہ کا معاملہ تو اس بارے میں یہ حدیث خاموش ہے۔

۶- وحدثنی عن مالک عن نافع، مولیٰ عبد اللہ بن عمر، اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَتَبَ اِلٰى عُمَّالِهٖ: اِنَّ اَهَمَّ اَمْرِكُمْ عِنْدِیَ الصَّلٰوةُ ۔ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهٗ ۔ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ ۔ ثُمَّ كَتَبَ: اَنْ صَلُّوا الظُّهْرَ اِذَا كَانَ الْفَیْءُ ذِرَاعًا اِلٰى اَنْ يَّكُوْنَ ظِلُّ اَحَدِكُمْ مِثْلَهٗ ۔ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ، قَدْرَ مَا يَسِيْرُ الرَّاكِبُ فَرْسَخَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةً، قَبْلَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ ۔ وَالْمَغْرِبَ اِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ ۔ وَالْعِشَاءَ اِذَا غَابَ الشَّفَقُ، اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ ۔ فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَيْنُهٗ؛ فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَيْنُهٗ؛ فَمَنْ نَامَ فَلَا نَامَتْ عَيْنُهٗ؛ وَالصُّبْحَ وَالنُّجُوْمُ بَادِيَةٌ مُشْتَبِكَةٌ ۔

□ ... حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام، نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے عمّال کو یہ ہدایت جاری کی کہ سب سے اہم ذمہ داری میرے نزدیک، نماز کی ہے۔ جس نے اس کی حفاظت اور نگرانی کی تو اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا تو وہ بقیہ دوسری چیزوں کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کرنے والا بن جائے گا پھر اس کے بعد ہدایت فرمائی کہ ظہر کی نماز پڑھو جب کہ سایہ ایک ذراع ہو۔ یہاں تک کہ تم میں سے کسی کا سایہ اس کے مثل تک ہو جائے اور عصر پڑھو اس وقت جب کہ سورج ابھی بلند ہو اور صاف اور چمکتا ہوا نظر آرہا ہو، ایسے وقت میں کہ ایک سوار، سورج ڈوبنے سے پہلے دو یا تین فرسخ چل سکے اور مغرب اس وقت جب سورج ڈوب جائے اور عشاء شفق غائب ہو جانے سے لے کر ایک تہائی رات تک۔ اگر اس سے پہلے کوئی شخص سو جائے تو اس کی آنکھ کو نیند کی ٹھنڈک نصیب نہ ہو؛ جو سو جائے تو اس کی آنکھ کو نیند کی ٹھنڈک نصیب نہ ہو؛ جو سو جائے تو اس کی آنکھ کو نیند کی ٹھنڈک نصیب نہ ہو۔

اور صبح کی نماز ایسے وقت میں پڑھو کہ ستارے بالکل نمایاں اور باہم گتھم گتھا ہوں۔

ذِرَاعًا : یعنی ایک گز کے برابر۔

اس روایت سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کی بنیادی چیزوں کے متعلق احکام اپنے گورنروں کو برابر بھیجتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ ان کے دورِ خلافت میں نماز کا نظام اور اس کا اہتمام ایک سرکاری معاملہ تھا، اس کی نوعیت پرائیویٹ معاملے کی نہ تھی۔ خلیفۂ وقت نے بذاتِ خود اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی کہ حکومت کے جو معاملات تمہارے ذمہ کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم معاملہ نماز کا ہے۔ یہ عمل آیت : اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ' (الحج - ۲۲ : ۴۱) (یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے) کی پوری پوری تعمیل میں ہے۔ جب سے نماز کا معاملہ حکومت کے فرائض سے باہر سمجھ لیا گیا ہے، نماز کی ہماری زندگیوں میں واقعی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اسلام میں خلیفہ یا سربراہِ مملکت اور اس کے ماتحت گورنروں وغیرہ کی نماز کے بارے میں ذمہ داریاں کیا ہیں اس روایت سے بخوبی واضح ہو رہی ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنے اس فرمان میں پہلی حقیقت یہ بیان فرمائی ہے کہ نماز دین کا اہم ترین ستون ہے، جس نے اس کی حفاظت کی اس نے پورے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔ ایک مومن کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام صلاح و فساد کا دارومدار نماز کے اہتمام اور عدم اہتمام ہی پر ہے۔

اس دور میں گھڑیوں کی سہولت موجود نہ تھی اس لیے اوقات کی وضاحت کے لیے ایسی علامات کو ذریعہ بنایا گیا جن کا مزاج دائمی اور آفاقی ہے اور ان کے ذریعے سے ایک عام دیہاتی بھی وقت کا تعین آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔

اس روایت میں نمازوں کے اوقات کا جو تعین کیا گیا ہے وہ مجمل طور پر یوں ہے :

(ا) **ظہر کا وقت** : سورج کے ڈھلنے پر ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک رہتا ہے جب کھڑی چیز کا سایہ اس کے قد کے مثل ہو جائے۔ اس روایت میں وہ چیز نہیں بتائی گئی جس کا سایہ زوال کے وقت ایک گز ہو۔

(ب) **عصر کا وقت** : جب سایہ ایک مثل سے تجاوز کر جائے تو عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں فرما دی کہ یہ نماز اس وقت ادا کرنی چاہیے جب سورج بلند اور صاف ستھرا نظر آ رہا ہو، ابھی زردی کا اثر اس پر شروع نہ ہوا ہو۔ اس وقت کے تعین کے لیے یہ بھی فرمایا کہ ایک سوار دو تین فرسخ

یعنی آٹھ نو میل مسافت طے کر سکے۔ یہاں سواری سے ظاہر ہے کہ اونٹ مراد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصر کا وقت اس وقت سے سویرے ہونا چاہیے جب ہمارے ہاں نمازِ عصر ادا کرنے کا رواج ہے۔

(ج) **مغرب کا وقت** : مغرب کا وقت سورج غروب ہونے پر شروع ہوتا ہے۔ سورج کے غروب ہونے کا وہی مطلب ہے جو ایک عام آدمی سمجھتا ہے کہ جب وہ مرایٔ العین سے بالکل غائب ہو جائے اس سے زیادہ تاخیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(د) **عشاء کا وقت** : شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو غروبِ آفتاب کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔ شفق غائب ہونے پر عشاء کا اول وقت ہو جائے گا۔ ہماری رائے میں جو شخص شفق غائب ہو جانے پر نماز پڑھے گا اس کی نماز اول وقت پر، وقت کے اندر ہی ہوگی، لیکن عشاء کی تاخیر اگر زیادہ نہ ہو تو فی الجملہ مستحسن ہے اگرچہ یہ دوسری نمازوں میں معیوب ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ملاحظہ ہو:

عن جابر بن سمرة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يؤخر صلوٰة العشاء الاخيرة[1]	حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عشاء میں تاخیر فرمایا کرتے تھے۔

(ھ) **فجر کا وقت** : اس کا ٹھیک وقت وہ ہوگا جب کہ ستارے بالکل نمایاں اور گتھم گتھا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب نماز اندھیرے میں ادا کی جائے۔ فجر میں لمبی قرارت کا حکم ہے، یہ تبھی ممکن ہے کہ نماز کا آغاز کافی سویرے ہو ورنہ تو طلوعِ آفتاب کا وقت ہو جائے گا۔ ایسی ہی صورتِ حال ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حرج نہیں کہ سورج یہ گواہی دیتا ہوا نمایاں ہوا کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایسی نماز بہرحال وقت کے اندر ہی متصور ہوگی۔

' فمن نام فلا نامت عینه ' : اس کی آنکھ کو نیند کی ٹھنڈک نصیب نہ ہو! ظاہر ہے کہ یہ ایک طرح کی بددعا ہے کہ نمازِ عشاء کی ادائیگی سے پہلے جو سو جائے تو خدا کرے کہ اس کی آنکھ نہ سوئے، یعنی یہ کہ اس کی آنکھ کو ٹھنڈک نصیب نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات بوجہ کراہیت تین مرتبہ دہرائی۔ اس سے اس غفلت کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ بغیر اس کے نہیں دہرائے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہوں۔

---

[1] صحیح مسلم : کتاب المساجد ، باب وقت العشاء وتاخیرها

۷۔ وحدثنی عن مالک عن عمه ابی سهیل عن ابیه انّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ کَتَبَ اِلٰی اَبِی مُوْسٰی: اَنْ صَلِّ الظُّهْرَ اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ، وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ بَیْضَاءُ نَقِیَّةٌ، قَبْلَ اَنْ یَدْخُلَهَا صُفْرَةٌ۔ وَالْمَغْرِبَ اِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ۔ وَاَخِّرِ الْعِشَاءَ مَا لَمْ تَنَمْ۔ وَصَلِّ الصُّبْحَ وَالنُّجُوْمُ بَادِیَةٌ مُشْتَبِکَةٌ۔ وَاقْرَاْ فِیْهَا بِسُوْرَتَیْنِ طَوِیْلَتَیْنِ مِنَ الْمُفَصَّلِ۔

□ ... مالک بن ابی عامر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت ابوموسٰی اشعریؓ کو فرمان لکھا کہ ظہر کی نماز پڑھو جب کہ سورج ڈھل جائے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھو جب کہ سورج نہایت روشن اور صاف ہو، قبل اس کے کہ اس میں کسی قسم کی زردی نمایاں ہوئی ہو اور نمازِ مغرب جب کہ سورج ڈوب جائے اور نمازِ عشاء کو اس وقت تک مؤخر کرو جب تک کہ تم سونے نہ لگو۔ اور صبح کی نماز پڑھو درآنحالیکہ ستارے بالکل نمایاں اور گتھم گتھا ہوں اور اس میں مفصّل میں سے دو طویل سورتیں پڑھو۔

'زَاغَتِ الشَّمْسُ' : سورج ڈھل جائے۔ یعنی سمتِ راست سے نیچے اتر گئے۔

'مَا لَمْ تَنَمْ' : یہاں 'مَا' ظرفیہ ہے یعنی جب تک تم سوتے نہیں ہو۔

یہ روایت بھی فرمانِ فاروقی ہے۔ اس میں بعض باتوں کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ عشاء کے سوا دوسری نمازوں کے اوقات کی وضاحت تو اوپر کی روایت میں ہو چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری نمازوں میں تو اوّل وقت میں نماز ادا کرنا زیادہ موزوں ہے البتہ نمازِ عشاء میں تاخیر ہونی چاہیے۔ اس روایت میں بھی تاخیر کا حکم ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جلد سونے کی خاطر نمازِ عشاء کی ادائیگی میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تاخیر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پسند فرمایا ہے کہ جس طریقہ سے مجاہد فی سبیل اللہ محاذ میں جنگ کا انتظار کرتا ہے اسی طریقہ سے جو لوگ عشاء کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا اجر پائیں گے۔

'مفصّل' سے مراد قرآن مجید کا آخری حصہ ہے جس میں سورۂ قٓ، سورہ ذاریات اور ان کے بعد کی سورتیں شامل ہیں۔ روایات سے ثابت ہے کہ یہ سورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر میں اہتمام

سے پڑھتے تھے۔

۸۔ وحدثنی عن مالک عن هشام بن عروة عن ابیه انّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ کَتَبَ اِلٰی اَبِی مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنْ صَلِّ الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ بَیْضَاءُ نَقِیَّةٌ، قَدْرَ مَا یَسِیْرُ الرَّاکِبُ ثَلَاثَةَ فَرَاسِخَ۔ وَاَنْ صَلِّ الْعِشَاءَ مَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ ثُلُثِ اللَّیْلِ۔ فَاِنْ اَخَّرْتَ فَاِلٰی شَطْرِ اللَّیْلِ، وَلَا تَکُنْ مِنَ الْغٰفِلِیْنَ۔

□ ... حضرت عروہ بن زبیرؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت ابوموسٰی اشعریؓ کو فرمان لکھا کہ ایسے وقت میں عصر کی نماز پڑھو کہ سورج بالکل صاف روشن نظر آ رہا ہو، ایسے وقت میں کہ ایک سوار تین فرسخ تک جا سکے اور عشاء کی نماز اس وقت کے اندر پڑھو کہ جو تمہارے اور ثلث شب کے درمیان ہے۔ اگر اس سے بھی کچھ پیچھے کرنا چاہو تو بس نصف رات تک، اور غافلوں میں سے نہ بن جانا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عشاء کی نماز کے وقت کی حد معیّن کر دی کہ عشاء کی نماز میں تاخیر اگرچہ ثواب ہے لیکن اس تاخیر کی بھی ایک حد ہے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ روایت کی رو سے عشاء کا صحیح وقت تہائی رات تک ہے اور حضرت عمرؓ نے تاخیرِ عشاء کو ثلثِ رات تک پسند کیا ہے۔ اس کے بعد نصفِ شب آخری حد ہے جہاں تک نمازِ عشاء پڑھنا روا ہے۔ اس کے بعد گویا عشاء کا وقت نہیں رہتا۔

'اور غافلوں میں سے نہ بن جانا' سے مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خیال سے کہ اور زیادہ ثواب ملے گا عشاء کو کچھ ٹالتے جائیں یہاں تک کہ نیند غلبہ پا جائے اور آپ اتنا غفیل پڑ کے سو رہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال مستعد ہو کر تاخیر سے نمازِ عشاء پڑھ لینی چاہیے۔

۹۔ وحدثنی عن مالک عن یزید بن زیاد عن عبد الله بن رافع، مولیٰ ام سلمة، زوج النبی صلی الله علیه وسلم انه سأل ابا هریرة عن وقت الصلوٰة۔ فَقَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ: اَنَا اُخْبِرُکَ۔ صَلِّ الظُّهْرَ اِذَا کَانَ ظِلُّکَ

مِثْلَكَ ۔ وَالْعَصْرَ إِذَا كَانَ ظِلُّكَ مِثْلَيْكَ ۔ وَالْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ ۔ وَالْعِشَاءَ مَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ ثُلُثِ اللَّيْلِ ۔ وَصَلِّ الصُّبْحَ بِغَبَشٍ ، يَعْنِي الْغَلَسَ ۔

□ ... حضرت عبداللہ بن رافع ، جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں ، سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے نماز کے وقت کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ ہاں ! میں تمہیں بتاتا ہوں ۔ سو ظہر کی نماز پڑھو جب کہ تمہارا سایہ تمہارے مثل ہو اور عصر کی نماز پڑھو جب کہ تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے اور مغرب کی نماز پڑھو جب کہ سورج ڈوب جائے اور تمہارے اور ثلثِ شب کے درمیان کا جو وقت ہے اس کے اندر عشاء کی نماز پڑھ لو اور صبح کی نماز پڑھو منہ اندھیرے ۔

اس روایت میں اوقاتِ نماز کی تمام علامات اوپر کی روایتوں میں زیرِ بحث آچکی ہیں ۔ البتہ اس سے ظہر کے وقت کے بارے میں اتنا اور معلوم ہو جاتا ہے کہ نماز کا وقت ایک مثل سایہ کے بعد بھی رہتا ہے اگرچہ یہ مؤخر ہونے کی وجہ سے پسندیدہ نہیں ، اور دو مثل سایہ ہو جانے پر نمازِ عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے ۔

یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ نمازِ ظہر کی باجماعت ادائیگی کے وقت میں لوگوں کی سہولت کو ملحوظ رکھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے ۔ مثلاً گرمیوں میں ذرا تاخیر سے نماز پڑھنے کا حکم ہے ۔ روایت ملاحظہ ہو :

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ
عليه وسلم انه قال : اذا اشتد	علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب گرمی کی شدت بڑھ جائے
الحر فابردوا بالصلوٰة[1]	تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو ۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نمازِ ظہر کو بالکل آخر وقت میں پڑھا جاتا تھا ، جیسا کہ حسبِ ذیل روایت سے ظاہر ہے :

عن انس بن مالك قال : كنا اذا	حضرت انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم
صلينا خلف رسول الله صلی الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی

[1] صحيح البخاری : كتاب مواقيت الصلوٰة ، باب الابراد بالظهر فی شدة الحر

عليه وسلم بالظهائر فسجدنا	نمازیں پڑھتے تھے اور حال یہ ہوتا تھا کہ گرمی
على ثيابنا اتقاء الحر[1]	کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے کپڑوں پر سجدہ
	کیا کرتے تھے ۔

۱۰ ـــ وحدثنی عن مالك عن اسحاق بن عبد الله بن ابی طلحة عن انس بن مالك اَنَّهُ قَالَ : كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَخْرُجُ الْإِنْسَانُ إِلَى بَنِي عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ فَيَجِدُهُمْ يُصَلُّونَ الْعَصْرَ ۔

□ ... حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم عصر کی نماز پڑھتے تھے ، پھر کوئی نکلنے والا بنی عمرو بن عوف کی طرف جاتا تھا تو ان کو عصر کی نماز پڑھتے ہوئے پاتا تھا ۔

یہ روایت صحیح بخاری ـــ کتاب مواقيت الصلوٰة ، باب ۱۳ ـــ اور صحیح مسلم ـــ کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة ، باب ۳۴ ـــ میں بھی ہے ۔

بنی عمرو بن عوف کا قبیلہ مدینہ سے دو میل کی مسافت پر آباد تھا ۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز اول وقت میں پڑھ لیتے تھے کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھ کر جانے والا ایک شخص ، دو میل کی مسافت طے کر کے ، بنی عمرو بن عوف کے ہاں پہنچتا تو ان کو بھی نمازِ عصر میں مشغول پاتا اگرچہ وہ بھی تاخیر کے باوجود عصر کی نماز اصل وقت میں ہی ادا کر رہے ہوتے تھے ۔

۱۱ ـــ وحدثنی عن مالك عن ابن شهاب عن انس بن مالك اَنَّهُ قَالَ : كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَذْهَبُ الذَّاهِبُ إِلَى قُبَاءٍ فَيَأْتِيهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ ۔

□ ... حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم عصر کی نماز پڑھتے پھر جانے والا قبا تک جاتا اور ان کے پاس اس حالت میں پہنچتا کہ سورج بلند ہوتا ۔

[1] صحيح البخاری : كتاب مواقيت الصلوٰة ، باب وقت الظهر عند الزوال

یہ روایت صحیح بخاری — کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۱۳ — اور صحیح مسلم — کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ۲۴ — میں بھی ہے۔

قُبا، مدینہ کے مضافات میں ہے۔ یہیں پر مشہور مسجدِ قبا، تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا فاصلہ مدینہ سے تقریباً تین میل ہے۔ اس روایت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجدِ نبوی میں عصر کی نماز کافی سویرے پڑھی جاتی تھی کہ ایک شخص نمازِ عصر سے فارغ ہو کر تین میل کی مسافت طے کر کے قُبا پہنچتا اور سورج ابھی بلند ہی ہوتا۔

۱۴ — وحدثنی عن مالك عن ربیعة بن ابی عبدالرحمٰن عن القاسم بن محمد انّهٗ قَالَ : مَا اَدْرَكْتُ النَّاسَ اِلَّا وَهُمْ يُصَلُّوْنَ الظُّهْرَ بِعَشِيٍّ۔

□ ... قاسم بن محمد روایت کرتے ہیں کہ ہم نے نہیں پایا لوگوں کو مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز پڑھتے تھے عشی کے وقت۔

’عشی‘ کے معنی ہیں زوال کے بعد کا وقت۔ اس وقت کا آغاز سورج ڈھلنے کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ظہر کا وقت ہوتا ہے اور یہ، جیسا کہ پہلے روایات میں گزر چکا ہے، اس وقت تک رہتا ہے جب سایہ ایک مثل ہو جائے۔

ان تمام روایات میں نمازوں کے اوقات کا ایک تخمینہ دیا گیا ہے جو دین کی اصل روح کے مطابق ہے۔ اگر ان حدود میں غلو پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان تخمینوں کو آپ بالکل کانٹے کی تول سوئی سے ناپنا چاہیں گے تو حنفیہ کی رائے اور ہو جائے گی اور شوافع کی اور۔ یہی چیزیں متأخرین میں پہنچ کر پہاڑ بن جائیں گی۔ ان اندازوں کے اندر رہ کر آپ کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ میرے لیے کتنی گنجائش ہے اور میں کتنا پابند ہوں۔ مثلاً حکم ہے کہ ’فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ‘ وضو میں چہرہ دھونا چاہیے۔ اس سے سیدھے سیدھے عرفِ عام میں، جس کو چہرہ کہتے ہیں وہ سمجھنا چاہیے اور اس کی حدود متعین کرتے وقت افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اب اگر آپ اس کے درپے ہو جائیں کہ کنپٹی کی سفیدی کا کیا حکم ہے اور غایت، منتہٰ میں داخل ہے یا نہیں تو ایک سیدھے سادے حکم کو اپنے لیے مشکل بنا لیں گے جو دین میں پسندیدہ بات نہیں۔

۱۳ — حدثنی یحییٰ عن مالك عن عمّه ابی سُهیل بن مالك عن ابیه انّهٗ قَالَ : كُنْتُ اَرٰى طِنْفِسَةً لِعَقِيْلِ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ تُطْرَحُ اِلٰى جِدَارِ الْمَسْجِدِ الْغَرْبِيِّ۔ فَاِذَا غَشِيَ الطِّنْفِسَةَ كُلَّهَا ظِلُّ الْجِدَارِ خَرَجَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَصَلَّى الْجُمُعَةَ. قَالَ مَالِكٌ (وَالِدُ اَبِيْ سُهَيْلٍ) : ثُمَّ نَرْجِعُ بَعْدَ صَلٰوةِ الْجُمُعَةِ فَنَقِيْلُ قَائِلَةَ الضَّحَاءِ۔

□ ... ابوسہیل بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ایک چٹائی کا ٹکڑا جو عقیل بن ابی طالب کا تھا، جمعہ کے دن مغربی دیوار کی طرف ڈال دیا جاتا تھا۔ تو جب اس چٹائی کے ٹکڑے کو دیوار کا سایہ پورا ڈھانک لیتا تھا تب حضرت عمر بن خطابؓ نکلتے تھے اور جمعہ کی نماز پڑھتے تھے (یا پڑھاتے تھے)۔ مالک (یعنی جو اس کے راوی ہیں) کہتے ہیں کہ پھر ہم لوگ جمعہ کی نماز کے بعد لوٹتے تھے اور دوپہر کا قیلولہ کرتے تھے۔

’طِنْفِسَة‘ سے مراد چٹائی، ٹاٹ یا دری کا ٹکڑا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا وقت معلوم کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے زمانے میں سادہ طریقہ یہ اختیار کیا جاتا تھا کہ ایک چٹائی کا ٹکڑا مسجدِ نبوی کی مغربی دیوار کی طرف ڈال دیا جاتا تھا۔ جب دیوار کا سایہ اس ٹکڑے کو پوری طرح سے ڈھانک لیتا تو حضرت عمرؓ جمعہ کی نماز کے لیے نکلتے اور نماز پڑھاتے۔ یوں تو سایہ زمین پر بھی متعین ہو جاتا ہے، لیکن یہ طریقہ زیادہ سہل اور قطعی خیال کیا گیا ہوگا اس لیے کہ معین چیز سے تعین بہرحال زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اوپر ایک روایت میں ایک ذراع کے فاصلے کا ذکر آیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس چٹائی کی چوڑائی بھی ایک ذراع کے بقدر ہوگی۔

جمعہ بہرحال اوّل وقت میں، سویرے ہی ادا کرنا چاہیے اس کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے:

عن انس بن مالك قَالَ : كُنَّا نُبَكِّرُ — حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم

بالجمعۃ ونقیل بعد الجمعۃ[1]
لوگ جمعہ کے دن سویرے نکلتے اور نماز کے بعد قیلولہ کرتے تھے۔

"ثم نرجع بعد صلوٰۃ الجمعۃ فنقیل قائلۃ الضحاء"؛ اس روایت کے راوی یعنی ابوسہیل کے والد بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کی نماز ادا کر کے ہم لوگ دوپہر کا قیلولہ کرتے تھے۔ گویا نماز اوّل وقت میں پڑھی جاتی تھی اور اس کے بعد لوگ دوپہر کی استراحت کرتے تھے۔

قیلولہ سے مراد دوپہر کے بعد کا وہ سونا ہے جس کا رواج ان ملکوں میں ہے جو بے حد گرم ہیں۔

یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعہ کی ادائیگی تک قیلولہ وغیرہ موقوف رکھتے تھے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہی ہے کہ مسلمانوں کو جمعہ کی نماز تک اسی کے اہتمام میں رہنا چاہیے اور لوگ اپنے گھروں سے کام کاج کے لیے اس وقت نکلیں جب نماز سے فارغ ہو جائیں، جیسا کہ فرمایا:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔
پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کے طالب ہو۔

(الجمعۃ - ۶۲ : ۱۰)

لہٰذا نمازِ جمعہ سے پہلے اپنے کاموں کے لیے نکلنا پسندیدہ نہیں ہے الّا آنکہ کوئی شدید ضرورت ہو۔ اگر گھر سے نکلنا ہی پڑے تو لوگ زیادہ دور دراز علاقوں میں اپنے کاموں کے لیے نہ نکل جائیں کہ پھر ان کو وقت پر لوٹنے میں زحمت ہو۔ آیت سے یہ بات تو نہیں نکلتی کہ نماز سے پہلے نکلنا حرام ہے البتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کرنا ناپسندیدہ بات ہے۔

۱۴ــــ وحدثنی عن مالک عن عمرو بن یحیٰی المازنی عن ابن ابی سلیط اَنَّ عُثْمَانَ ابْنَ عَفَّانَ صَلَّی الْجُمُعَۃَ بِالْمَدِیْنَۃِ وَصَلَّی الْعَصْرَ بِمَلَلٍ۔

□ ... ابن ابی سلیط سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز مدینہ میں پڑھائی اور عصر کی نماز آکر کے ملل میں پڑھی۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب وقت الجمعۃ اذا زالت الشمس

ملل مدینہ سے انیس بیس میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔

اس روایت کی وضاحت میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "وذالک للتھجیر وسرعۃ السیر"۔ یعنی ایسا اس لیے ہوا کہ جمعہ کی نماز بہت سویرے پڑھی اور اونٹ تیز رو تھا یعنی اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز نہایت اوّل وقت میں پڑھائی۔ دوسرے یہ کہ ان کی سواری تیز رو تھی۔ تبھی یہ ممکن ہوا کہ جمعہ اور عصر کے مابین آپ نے انیس بیس میل کی مسافت بھی طے کر لی۔

امام مالک کے نزدیک نمازِ جمعہ اوّل وقت میں پڑھ لینی چاہیے۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلک عین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل کے مطابق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل تو ان روایات سے واضح ہے؛ رہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل تو گو اس باب میں ان سے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی، لیکن ان کے جانشینوں کے عمل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیش رو ہی کی تقلید میں ایسا کرتے رہے ہوں گے۔ اگر ان کا عمل اس سے مختلف رہا ہوتا تو اس کا پتا ضرور چل جاتا۔

(ترتیب : ماجد خاور)

نظامِ نبوّت
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں

نظامِ نبوت سے مراد خلق کی ہدایت کا وہ خدائی نظام ہے جو انبیاء علیہم السلام، وحی اور آسمانی کتابوں کی اساس پر قائم ہوا جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور اس کی تکمیل حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی۔

اس نظام سے متعلق اس دور میں بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پایا جاتا ہے نسان اپنی عقلی فتوحات کے لحاظ سے اس وقت ایسے بلند مقام پر پہنچ چکا ہے کہ وہ زمین کے نشیب و فراز کو مسخر کر کے آسمان کے ثوابت اور سیاروں پر کمندیں ڈال رہا اور خلا میں اپنے ے اور مورچے قائم کرنے کے درپے ہو رہا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے اندر خیر و شر کی اتنی معرفت تا ہے کہ وہ متمدن اور شائستہ انسان کی زندگی بسر کر سکتا اور ایک مہذب معاشرہ کا فرد بن سکتا ۔ وہ اپنے پاس اسلاف کے افکار و عقائد، ان کی روایات، ان کے احکام و قوانین اور ان لوم کا اتنا بڑا ذخیرہ رکھتا ہے کہ اس کی اساس پر وہ ایک عظیم سلطنت قائم کر سکتا ہے۔ تو کیا ن کی زندگی کی تنظیم کے لیے یہ ساری چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آخر وہ ضرورت کیا ہے جس پورا کرنے کے لیے نبوت کا نظام قائم کیا گیا اور انسان کو اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے؟ قل اور وحی کے دونوں نظام انسان کے لیے ضروری ہیں تو ان دونوں میں تعلق کی نوعیت کیا ، ان کے حدود کیا ہیں اور اگر ان میں کوئی تصادم ہو تو ان کے درمیان توفیق کی کیا صورت ہے؟ والات پر تمام اچھے فلسفیوں نے بھی غور کیا اور قرآن مجید نے بھی ان کی وضاحت کی ہے۔ میں والوں کے بارے میں پہلے فلسفیوں کی رائے پیش کروں گا، پھر اس پر تنقید کروں گا اور اس د آپ کو بتاؤں گا کہ اس معاملے میں قرآنِ مجید نے ہمیں اور آپ کو کیا رہنمائی دی ہے۔

اہلِ فلسفہ کا نقطۂ نظر

انسان کی ہدایت کے معاملے میں اہلِ فلسفہ کے تین مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک گروہ کا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ عقل اگرچہ بڑی چیز ہے لیکن زندگی کے مسائل اور اس کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے اندر وحی کا بدرقہ حاصل نہ ہو تو کسی کے لیے کامیابی کے ساتھ اس راستے کو طے کرنا آسان نہیں۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ عقل کی رسائی تو ہے ہی بہت محدود۔ الٰہیات اور دینیات کے تمام اہم مسائل میں عقل کو مطلقاً کوئی دخل نہیں۔ ان سے متعلق امور میں وہ کسی مافوق فطرت اور مافوق بشر رہنمائی کے محتاج ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل ہیں ہی ایسے کہ عقل کے راستے سے وہ انسان کے اندر نہیں اترتے بلکہ دل کے راستے سے اترتے ہیں۔ لہٰذا عقل کا ان معاملات میں کوئی دخل ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم عقل سے واقف ہیں۔ وحی یا الہام کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس کی اطاعت کریں اور اس کا اتباع کریں۔

ارسطو کی رائے:

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے اس میں یوں شامل تو سقراط اور افلاطون بھی ہیں لیکن میرے سامنے واضح طریقے پر ارسطو کی رائے ہے جس کو میں اس گروہ کے نمائندے کی رائے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو حقائق انسانی عقل سے ماوراء ہوں اس کو وہ وحی کے ذریعے بتائے جائیں۔ بلکہ اس کو ایسے حقائق کا بتایا جانا بھی ضروری ہے جو عقل کی دسترس کے اندر ہوں، کیونکہ ان میں بھی بڑے اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ وحی کی رہنمائی انسان کو ان مسائل میں بھی حاصل ہو۔

کانٹ اور لاک کی رائے:

تحریک احیائے علوم (RENAISSANCE) کے بعد کے دور کے سب سے نامور حکما

کانٹ (KANT) اور لاک (LOCKE) ہیں۔ کانٹ کہتا ہے کہ زندگی کے مسائل نہایت مشکل ہیں۔ عقل زیادہ اہم مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اگرچہ اس کے قیمتی اشارات کی ناقدری نہیں کی جاسکتی۔ تاہم یہ اپنے اعتماد پر منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی رہنمائی انسان کو حاصل ہو۔

سترھویں صدی کا نامور فلسفی جان لاک فہم انسانی پر اپنی کتاب کے باب ۱۹ میں کہتا ہے کہ بعض باتیں پوری طرح ہماری عقل کی گرفت میں نہیں آتیں۔ ایسی باتیں اگر وحی کے ذریعے ہمیں بتا دی جائیں تو یہ ایمان کا موضوع ہیں۔ یعنی قصہ آدم و ابلیس یا احوال حیات بعد الممات۔ وہ یہ کہتا ہے کہ خدا نے ہمیں عقل دے کر اپنے ہاتھ باندھ نہیں لیے ہیں کہ وہ رہنمائی نہ کرے۔ اسے رہنمائی کرنی چاہیے اور وہ یہ رہنمائی کرتا بھی ہے۔ لاک کی رائے میں عقل اور وحی میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں۔ یہ دونوں الگ چیزیں نہیں ہیں۔ وحی درحقیقت عقل ہی کی تکبیر (ENLARGEMENT) ہے۔ یعنی جس طریقہ سے ایک کرہ دوربین کے اندر طاقتور عدسہ (LENS) ڈال کر اس کی طاقت کو بہت زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بہت دور تک دیکھ سکتی ہے، اسی طرح وحی عقل کی طاقت، اس کی دوربینی، اس کی بصیرت اور اس کی روشنی کو اتنا بڑھا دیتی ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کے نہیں بلکہ آخرت کے مسائل پر بھی غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے۔ وہ ان لوگوں پر جو دینی معاملات سے عقل کو بے دخل کرنا چاہتے ہیں تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو آدمی وحی کی جگہ بنانے کے لیے عقل کو نکال باہر کرتا ہے وہ ان دونوں کی روشنی گل کر دیتا ہے۔

پاسکل کی رائے:

اب دوسرے گروہ کو لیجئے جو یہ کہتا ہے کہ عقل کی رسائی بہت محدود ہے۔ اصل مسائل الٰہیات اور دینیات کے مسائل ہیں۔ ان کے ضمن میں عقل کو سرے سے کوئی دخل نہیں۔ یہ چیزیں دل کے راستے سے داخل ہوتی ہیں۔ جو اوپر سے الہام کرتے ہیں وہ عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ اور یہ الہام ان دلوں پر نازل ہوتے ہیں جن میں ان کی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ ان الہاموں کو اختیار کر لیتے ہیں اور عقل کہیں بھی دخیل نہیں ہوتی۔ اس گروہ میں قابلِ ذکر فلسفی پاسکل (PASCAL) ہے جو کہتا ہے کہ دینیات کے اصول فطرت اور عقل سے بلند ہیں۔ انسانی دماغ اپنی کوشش سے ان تک رسائی نہیں پا سکتا۔ ان اصولوں کا علم جبھی ہو سکتا ہے جب وہ ایک مافوق الفطری طاقت

کے ذریعے دیئے جائیں۔

متکلمین کی رائے:

اسی زمرہ میں متکلمین کو بھی شمار کیجئے، خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان۔ ہمارے صوفیاء کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ یہ لوگ دینی اور روحانی امور میں عقل کا کوئی دخل نہیں سمجھتے۔ عیسائی متکلمین کی ترجمانی سینٹ آگسٹائن یوں کرتا ہے:

"ہم سامنے کی موجود چیزوں پر شہادت اپنے حواس سے لاتے ہیں۔ . . . . جو چیزیں حواس کے دائرہ سے باہر ہوں وہاں ضروری ہوتا ہے کہ شہادت کے لیے ہم دوسروں پر انحصار کریں .... جس طرح ظاہری اشیاء کے بارے میں ہمارا طرز عمل ہے اسی طرح رُوح کے باطنی معاملات میں بھی یہی بات ہمیں زیب دیتی ہے کہ ہم ان لوگوں پر اعتماد کریں جنھوں نے ان کو غیر مادی شکل میں دیکھا ہو۔ پیغمبروں پر اعتماد کرنے کی وجہ یہی ہے۔"

صوفیاء کے امام — مولانا رومی — اہلِ عقل کے بارے میں فرما گئے ہیں کہ:

پائے استدلالیاں چوبیں بود

یعنی فلسفے اور عقل سے کام لینے والے تو لکڑی کے پاؤں سے چلتے ہیں۔ ان کے پاس ہے ہی کیا؟

مسلمان متکلمین میں سب سے بڑا گروہ اشاعرہ کا گروہ ہے۔ مسلمانوں کا بہت بڑا گروہ انھیں کا پیرو ہے۔ یہ گروہ بھی دین میں عقل کے کسی دخل کا قائل نہیں۔ وہ دین میں حکمت کا بھی قائل نہیں۔ نہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کسی کام کو کسی علت، کسی حکمت یا کسی سبب کی بناء پر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک خیر و شر کے معاملات میں انسان کی حیثیت ایک مادر زاد نابینا کی ہے جو ہر وقت عصاکش کا محتاج ہوتا ہے۔

ہابس کی رائے:

اہلِ فلسفہ کے تیسرے گروہ کے سرخیل کی حیثیت جس فلسفی کو حاصل ہو سکتی ہے وہ ہابس (HOBBES) ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ ہم جس چیز سے واقف نہیں، جس چیز کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں، ہم اس کو مان کیسے سکتے ہیں؟ ذاتی فوق الفطری الہام کے بغیر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی بات پر جو الہام پانے کا مدعی ہو کیسے یقین کر سکتا ہے اور اس کی اطاعت پر اس کو

کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے ؟ اسی طرح کسی دوسرے کے الہام پر اعتماد ناممکن ہے۔ لہٰذا عقل میں وحی کو ماننے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس وقت مادیت اور لادینیت کا جو دور ہے اس میں عقلیت کا بھی چیلنج ہے۔ اس زمانے میں غالب فلسفہ یہی ہے کہ عقل انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہے اور اگر وہ کافی نہ بھی ہو تو لوگ وحی والہام کے طریقہ کو اس لیے ماننے کو تیار نہیں کہ انہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں۔

فلسفیوں کی آراء پر تنقید

اب میں ان تینوں گروہوں کے فکر پر مختصر تنقید کروں گا تاکہ آپ ان کے ضعف اور قوت کا اندازہ کر سکیں۔

ماننے کے لئے تجربہ کی شرط :

سب سے پہلے آخری گروہ کو لیجئے جس کا نمائندہ ہابس ہے۔ اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم صرف اس چیز کو مان سکتے ہیں، اسی چیز کو ماننا چاہیئے اور اسی چیز کو ماننے پر ہمیں مجبور کیا جا سکتا ہے جس چیز کا ہمیں تجربہ ہے۔ یہ فلسفہ نیا نہیں۔ بعینہٖ یہی بات کفار قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی تردید میں کہتے تھے۔ وہ پوچھتے تھے کہ اگر تمہارے گمان کے مطابق تم پر وحی آتی ہے تو ہم پر کیوں نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ یہ سخت قسم کی سوفسطائیت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا ہے یا آپ کو شعر کا تجربہ نہیں ہے تو آپ کسی کو شاعر ماننے کے لیے تیار نہ ہوں۔ ہوا کریں سعدی اور حافظ یا غالب اور حالی اور ہوا کریں شبلی اور اقبال لیکن چونکہ خود آپ کو شعر کا تجربہ نہیں اس لیے آپ ان کو شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح آپ کو اگر یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی ہے کہ آپ کوئی تقریر کر سکیں تو آپ کسی کو خطیب ماننے پر تیار نہ ہوں کہ چونکہ خود ہمیں خطابت کا کوئی تجربہ نہیں، اس لیے ہم کس طرح یہ مان سکتے ہیں کہ ڈیماستھنیز یا برک کوئی بڑے خطیب تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس خیال کے حامل لوگوں نے اگر کبھی ایک اینٹ پر دوسری اینٹ نہیں رکھی تو انجینئرنگ کے کسی کارنامے کا ان کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اور لاہور کا شالامار باغ بنانے والے لوگوں کی یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ اس گروہ کی دلیل محض انانیت اور ضد پر مبنی ہے۔ عقل میں اس کی کوئی بنیاد نہیں

عقل کے بجائے دل کے راستے پانے کی شرط :

دوسرا گروہ جس کا نمائندہ پاسکل ہے، دین کے اندر کسی عقل کا دخل نہیں مانتا۔ وہ اس ہیز کو ماننا چاہتا ہے جو دل کے راستے آئے۔ انہوں نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ دل ؔ خیالات، جذبات، احساسات، روایات اور نہ جانے کن کن چیزوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ اقعہ ہے کہ دل کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ہر چیز اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔ انسان کو قلاً اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ جو کچھ دل میں آجائے وہ سب کو مان لے۔ اس کے یے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر مانے۔ ورنہ وہ آدمی بالکل ہی آبرو باختہ و کر رہ جائے گا۔ آدمی کے لیے افکار، خیالات اور دل کی خواہشوں میں سے انہیں کو ماننا معقول رجائز ہے جن کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اس نے یہ جان لیا ہو کہ وہ ٹھیک ہیں۔ اس فلسفہ نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے۔ یورپ میں سٹیٹ اور کلیسا کی تقسیم اسی بات پر ہوئی۔ دین کو جو ے عقلی کا مجموعہ مانا جاتا ہے اس کی بنیاد میں بھی اس فلسفہ کا ہاتھ ہے۔ انسان کے اندر اصلی رہر یہ ہے کہ اس کے اندر خواہشیں اور تمنائیں جو کچھ بھی ہوں اس کی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے۔ انسان کو عقل دی ہی اس لیے گئی ہے۔ میرے نزدیک فلسفیوں ا یہ خیال بہت کمزور ہے۔

حی کا مقام تسلیم کرنے والوں کی رائے :

فلسفیوں کا پہلا گروہ جس کا نمائندہ ارسطو ہے جس طرح بات کرتا ہے اس میں وحی اور عقل ونوں کا مقام محفوظ ہے۔ دونوں کو پورے توازن کے ساتھ ٹھیک ان کی جگہ دی ئی ہے۔ یہ نقطہ نظر رکھنے والے مذکورہ تینوں فلاسفر دنیا کے بہت بڑے حکیم مانے گئے ں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ عقل اگرچہ بہت بڑی چیز اور بہت بڑی نعمت ہے لیکن زندگی مشکلات ر اہم مسائل کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو وحی کی کمک بھی حاصل ہو۔ میرے دیک یہ رائے صائب ہے اور اس سلسلہ میں لاک کی یہ بات تو آب زر سے لکھے جانے ے قابل ہے کہ وحی عقل کی تکبیر ہے وحی عقل کی قوت کو بڑھا دیتی ہے اور اس کا دائرہ بہت سیع کر دیتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عقل اگر دنیا کے محدود دائرے کو دیکھنے کی اہل ہے تو وحی اس

کی رسائی اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ وہ آخرت کے امور کو بھی سمجھ سکے۔

عقل اور نقل کی نزاع :

عقل اور وحی دونوں کا مقام متعین ہونے کے بعد یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ عقل اور نقل میں جو پرانی جنگ مانی جاتی ہے اس کی حقیقت میں کوئی بنیاد نہیں۔ ظاہر ہے کہ عقل دینے والا بھی رب ہے اور وحی کا بھیجنے والا بھی رب ہے تو ان دونوں چیزوں میں تناقض اور تضاد ہو کیسے سکتا ہے؟ ان میں تضاد اور تناقض ہونا عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقل کے مطالبات ہی ہیں جن کی وحی نے علی رؤوس الاشہاد منادی کی ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں کامل توافق ہے۔

اس حقیقت کے باوجود اگر یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ عقل اور وحی میں تضاد نظر آئے تو جاننا پڑے گا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کی وضاحت امام ابن تیمیہؒ نے کی ہے۔ میں ان کی رائے یہاں مختصر طور پر بیان کروں گا اور اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بھی اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ امام ابن تیمیہؒ نے عقل اور نقل پر جو رسالہ لکھا ہے اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ اگر آپ کو عقل اور وحی میں کوئی اختلاف نظر آتا ہے تو اس کے چند اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عقل کا جو اصول قائم کیا گیا اور جس کی صحت پر بڑا ناز تھا اور آج تک جس پر اجماع اور اتفاق مانا گیا تھا وہ اصول ہی سرے سے غلط تھا۔ انہوں نے اس کی ایسی ایسی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ فلسفہ کے بعض مسلّم اصولوں کے انہوں نے بخیے ادھیڑ دیئے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی کوئی بنیاد نہیں۔

اگر ایک اصول عقل اور منطق کی کسوٹی پر ہر اعتبار سے صحیح ثابت ہوتا ہے تو اب یہ غور کرنا ہوگا کہ نقل میں کونسی چیز ہے جو اس کی معارض اور منافی ہے۔ اگر یہ قرآن مجید کی کوئی آیت ہے تو اس کو الفاظ، نظم قرآن، سیاق و سباق اور نظائر قرآن کی روشنی میں اچھی طرح جانچنا ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی فکر میں کیا خامی ہے۔

مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک غلط شان نزول کی بناء پر آپ نے کسی آیت کا ایک مطلب لے لیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کے اوپر اجماع ہے حالانکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی یا کسی غلط روایت کو اہمیت دے دی تھی اور اس کی بنیاد پر الفاظ اور سیاق و سباق ہر چیز کو چھوڑ کر ایک غلط معنی لے لیے

تھے اور سمجھ لیا گیا کہ عقل اور نقل دونوں میں تصادم ہو گیا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی حدیث عقلی اصول کے معارض نظر آتی ہو تو اس پر غور کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ حدیث اپنے راویوں کے لحاظ سے بہت سارے ضعف چھپائے ہوئے ہو۔ اور اگر راویوں کے لحاظ سے مضبوط ہے تو ہو سکتا ہے کہ درایت کے اصولوں پر پوری نہ اترتی ہو۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ان تینوں باتوں میں سے یا تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ:

عقل کا اصول غلط قائم کر لیا گیا تھا یا قرآن کی آیت صحیح طور پر نہیں سمجھی گئی تھی یا کسی کمزور روایت کی بنیاد پر عقل اور نقل میں خواہ مخواہ ایک تصادم فرض کر لیا گیا تھا۔ میرے نزدیک ابن تیمیہ کا یہ تجزیہ نہایت لاجواب ہے اس طریقہ سے میں نے جب بھی غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وحی اور عقل سلیم میں کہیں کوئی تناقض نہیں۔

قرآن مجید کا نقطہ نظر

اب دیکھئے کہ قرآن کریم عقل اور نقل کے قضیے میں ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان وہ کس نوعیت کا ربط قائم کرتا ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک وحی عقل کی تطہیر اور تزکیہ کرتی ہے۔ عقل کی تربیت کرتی ہے اور عقل کی تکمیل کرتی ہے۔

وحی عقل کی تطہیر و تزکیہ کرتی ہے :

تطہیر و تزکیہ سے مطلب یہ ہے کہ انسان کی عقل ہے تو بڑی نعمت لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس کو استعمال کرنا بہرحال انسان کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے تو اس کو نہ استعمال کرے یا غلط استعمال کرے یا جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک شمشیر دو دم ہے۔ اس وجہ سے انسان بہت سارے غلط قسم کے مقدمات۔ غلط قسم کے نظریات اور غلط قسم کے اصول بھی قائم کر لیتا ہے۔ عقل میں یہ بات بھی ہے کہ عقل مرعوب ہو جاتی ہے۔ عقل مصلحت اندیش بھی ہو جاتی ہے۔ انسان کے مصالح کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہوتا ہے کہ عقل کا حق کیا ہے لیکن اپنی مصلحت اندیشی کی وجہ سے جان بوجھ کر عقل کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے الٹی منطق پیدا کر دے تو وہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس طریقہ سے عقل نے جو

غلط سلط انبار جمع کر دیا ہے وحی آ کر اس کی تطہیر و تزکیہ کر دیتی ہے۔ اس کو درست کر دیتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ یہاں تمہاری منطق غلط ہے یا اس میں تمہارا صغریٰ کبریٰ کوئی بھی درست نہیں۔

وحی عقل کی تربیت کرتی ہے:

تربیت کا مطلب یہ ہے کہ وحی انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ جن دائروں کے اندر انسان کو اپنی عقل کے اوپر چھوڑا گیا ہے تو عقل ان میں بھٹکنے نہ پائے۔ اس لیے وحی زندگی کے ہر شعبے میں چاروں گوشے (FOUR CORNERS) معین کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ان کے اندر جو وضع کردہ اصول عقل کے محکم اور قطعی اصول ہوتے ہیں۔ ان میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کے دائروں کے اندر رہ کر عقل جتنی جولانی کرتی ہے جتنا اجتہاد کرتی ہے، جتنا سوچتی ہے، جتنا فکر کا ذخیرہ پیدا کرتی ہے اس میں کسی گمراہی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس تربیت کے نتیجہ میں عقل اجتہاد کی تمام مہمات کو سر کر لیتی ہے۔ اگر وہ کسی خطرہ سے دوچار ہوتی ہے تو وحی کے نشانات راہ اس کو سگنل دے کر متنبہ کر دیتے ہیں کہ یہاں تم غلطی پر ہو اور تمہیں فلاں سمت میں جانا ہے۔

وحی عقل کی تکمیل کرتی ہے:

تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ عقل چونکہ انسان کا اعلیٰ جوہر اور اس کی اصلی صفت ہے اس لیے یہ تمام بڑے حقائق کے دروازوں پر دستک تو دے دیتی ہے لیکن دروازوں کو کھول کر ان کے اندر کے تمام اسرار سے واقف ہونا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ وحی ان دروازوں کو کھول کر ان کے اندر کی بھی سیر کرا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر عقل آسمان و زمین کے عجائبات اور نظام کو دیکھ کر اس نتیجے تک قطعاً پہنچ جاتی ہے کہ دنیا کو کسی بڑے حکیم، بڑے مدبر اور بڑی طاقت والے نے حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے خالق کی تمام صفات کیا ہیں اور ان صفات کے تقاضے کیا ہیں، ان کی بنا پر کیا چیزیں واجب ہو جاتی ہیں اور کیا چیزیں ان تقاضوں کے منافی ہیں۔ ان بڑے بڑے سوالات کو سمجھنے میں عقل کو بڑی الجھنیں پیش آ سکتی ہیں۔ وحی ان تمام الجھنوں کو دور کر دیتی ہے۔

اسی طرح قیامت کا مسئلہ ہے۔ اس نتیجے تک تو ہر آدمی جس کی عقل سلیم ہے پہنچ جاتا ہے کہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے۔ یہ یونہی نہیں ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ دنیا بالبداہت

ناتمام ہے اور اگر یہ اسی طرح ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی دن نہیں آتا تو اس کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ یہ کسی ظالم کھلنڈرے کا کھیل ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو انسان کی حیثیت بالکل ایک شترِ بے مہار کی ہو جاتی ہے کہ پیدا ہوا تو اس لیے کہ کھائے پیئے، کھیلے کودے، شرارتیں کرے، بدمعاشیاں کرے اور اس کے بعد ایک دن فنا ہو جائے۔ دنیا کے حکیم اور مدبر خالق سے ایسی ظالمانہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دنیا بازیچۂ اطفال نہیں ہے اس دنیا کی زندگی کے بعد دوسری زندگی لازم ہے جس میں ضروری ہے کہ انصاف ہو اور جزا و سزا ہو۔ یہاں تک عقل آدمی کو پہنچا دیتی ہے لیکن روزِ انصاف کس شکل کا ہو گا، اس دن کیا ہو گا، کن کن کی گواہیاں ہوں گی، مجرموں کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا اور اچھوں کو کیا جزا دی جائے گی۔ یہ ساری تفصیلات وحی کے بتانے کی ہیں۔ وحی کے اسی کام کو میں نے عقل کی تکمیل سے تعبیر کیا ہے۔

وحی نورِ فطرت کو کامل کرتی ہے:

وحی کا دوسرا کام یہ ہے کہ وحی نورِ فطرت کو کامل کر دیتی ہے۔ فطرت کے اس نور کا قائل ارسطو بھی ہے۔ وہ اس کو شعلۂ یزدانی (DIVINE SPARK) سے تعبیر کرتا ہے۔ خیر و شر میں امتیاز کے لیے انسان کے پاس یہی روشنی ہے لیکن اس میں بھی وہی کمزوری ہے جو عقل میں ہے۔ انسان کو چونکہ اختیار حاصل ہے اس لیے وہ اپنی فطرت کو چاہے تو بگاڑ بھی سکتا ہے اس چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں واضح فرمایا:

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ
(صحیح مسلم: کتاب القدر)۔

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ہر بچہ فطرتِ ابراہیمی پر پیدا ہوتا ہے لیکن سوسائٹی، ماحول، معاشرہ، درس گاہیں، ٹی وی، ریڈیو، اداکار مل کر فطرت ابراہیمی پر پیدا ہونے والے اس بچے کو شیطان بنا دیتے ہیں۔ پس فطرت کا نور بہت بڑی نعمت ہے لیکن وہ بھی بڑے نرغے میں ہے۔ وحی اس نور کو نور کامل بنا دیتی ہے کہ پھر اس کی روشنی ایک وسیع دائرے میں خیر و شر کے تمام اصولوں کو معین کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی تمثیل قرآن مجید نے طاق کے چراغ سے دی ہے اور وحی کو نُورٌ علیٰ نُور، روشنی پر روشنی قرار دیا ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ
(النور - ۲۴ : ۳۵)

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے ۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو۔ شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی۔

یعنی فطرت کے اندر جو نور ہے وحی کا نور آ کر اس کو بالکل جگمگا دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ تمام آفاق اس سے روشن ہو جاتے ہیں۔

وحی انسان پر حجت تمام کر دیتی ہے:

وحی کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ انسانوں کے اوپر حجت تمام کر دیتی ہے ۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے اور فطرت کی جتنی روشنی سے نوازا ہے اس کی بنا ، پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چاہے تو اس سے سوال کر سکتا ہے اور اس کو سزا و جزا بھی دے سکتا ہے ۔ بہت سے امور ایسے ہیں کہ جن پر سوال ہوگا بھی ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ڈھیل اور بہت رخصت دی ہے ۔ اس نے اس بنیاد پر انسان کو سزا دینا پسند نہیں کیا ۔ لہٰذا عقل و فطرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ انبیاء کے ذریعے وحی کی روشنی اور آسمانی ہدایت بھیج کر اس نے انسان کے اوپر اس طرح حجت تمام کر دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو دنیا میں بھی غلط کار انسانوں پر عذاب بھیج سکتا ہے اور یہ تو بہر حال ہوگا کہ آخرت میں وہ پکڑ لیے جائیں گے اور ہر شخص سے چھوٹی بڑی چیزوں سب کے متعلق سوال ہوگا۔ قرآن مجید نے بہت وضاحت سے یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے اپنا آخری رسول بھی اس لیے بھیج دیا کہ قیامت کے دن کوئی عذر کسی کے پاس نہ رہ جائے ۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ
(النساء - ۴ : ۱۶۵)

اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا ، تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے ۔

خلاصۂ بحث :

پس قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے تاکہ اس کی بنا ، پر وہ ایک غور کرنے والا انسان بنے ۔ فطرت کی روشنی دی ہے کہ وہ مہذب اور شائستہ بنے ۔ خیر و شر میں تمیز کرے ۔ اور حیوان مطلق نہ بن جائے ۔ اس کے بعد وحی کی تعلیم اور کتاب نازل کر کے اس نے انسان کے لیے صحیح اور غلط اور خیر اور شر کو نہایت واضح کر دیا ہے تاکہ اس کے پاس غلط رویہ اختیار کرنے کا کوئی عذر باقی نہ رہ جائے ۔ عقل اور وحی دونوں کا منبع ایک ہی ہے ۔ لہٰذا ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں بلکہ کامل موافقت ہے ۔ عقل کی نارسائی کی بنا ، پر یہ ضروری ہے کہ انسان وحی کی تعلیم کو مشعلِ راہ بنائے اور اس سے تربیت اور تزکیہ حاصل کرے ۔

(ترتیب : خالد مسعود)

حکمتِ قرآن (۳)

شکرِ نعمت کا نتیجہ ـــ حکمت

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ غنی (بے نیاز) ہونے کے ساتھ ساتھ حمید (قابلِ ستائش) بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی کو فقر اور احتیاج لاحق ہو اور پھر بھی وہ ستائش کے کمال کو پہنچا ہوا ہو۔ خداوند تعالیٰ نہ ہی کسی ذاتی نفع کے لیے کوئی فعل کرتا ہے اور نہ ہی بغیر فعل کے رہتا ہے کیونکہ بیکار تو اس سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے جو ذاتی منفعت کے لیے کام کرنے والا ہو۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ہر فعل صرف شفقت و رحمت کے باعث ہوتا ہے اس لیے وہ غنی بھی ہے اور حمید بھی۔ وہ اپنے استغناء اور کمال کے سبب سے بھی حمید ہے اور اپنی شفقت کے لحاظ سے بھی حمید ہے۔

شکرِ نعمت سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے :

فعلِ تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے انعام کا پہلا اور کامل ترین اظہار ہوا۔ اس کے بعد اس نے خلق کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا جس سے خلق پر یہ واجب ہوگیا کہ وہ خدا کی حمد کرے اور اس کا شکر بجالائے۔ بے حد و حساب نعمت و فضل سے نوازنے والی رحیم ہستی، جس نے پہلے نعمت عطا فرمائی، کیسے ممکن ہے کہ بندوں کے شکر ادا کرنے کے نتیجہ میں اپنی نعمتوں میں اضافہ نہ کرے۔ اس لیے فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ	اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمہیں بڑھاؤں گا۔

(ابراھیم - ۷)

اللہ تعالیٰ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ وہ خود حق ہے اور حق ہی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ	کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ؟

(التین - ۸)

اسی حقیقت کو ایک مقام میں اس نے اس طرح واضح فرمایا:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ	کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے ؟
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ	تمہیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو ؟

(القلم - ۳۶)

اسی لیے آیت لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ کے فوراً بعد یہ بھی فرمادیا:

وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ	اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بڑا سخت ہوگا۔

(ابراھیم - ۷)

اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ اس حق و انصاف کے مطابق ہے جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرتا اور ایک چیز کو اسی جیسی دوسری چیز کے ساتھ جوڑتا ہے لہٰذا جس طرح شکر فضل میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اسی طرح ناشکری پہلے سے موجود نعمت کو بھی چھین لیتی ہے۔ اگر نتیجہ کو عمل سے مطابق کرنے کا قاعدہ جاری نہ ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ کسی خوب کار کو محبوب رکھتا اور نہ کوئی نیک آدمی نیکی کو اختیار کرتا۔ پس شکر کرنے والے پر نعمت کی زیادتی ایک حق واجب ہے۔ بالکل اسی طرح اس کے برعکس عمل یعنی ناشکری پر سزا کا ملنا بھی واجب ہے۔

حکمت سب سے بڑی نعمت ہے :

شکر کا جذبہ نعمت کی قدر پہچاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ قدر پہچاننے کا مطلب نعمت کو اس کا ٹھیک مقام دینا اور جس مقصد کے لیے وہ دی گئی اسی مقصد میں اس کو استعمال کرنا ہے۔ نعمت کو استعمال میں نہ لانا بھی اس کو ضائع کرنا ہے لیکن اس کو اس کے مقصد کے خلاف استعمال کرنا اس کا زیادہ بڑا ضیاع اور شدید قسم کی ناشکری ہے جو شخص نعمت کی قدر پہچانتا ہے اور وجود، حیات، علم، خیر کی معرفت، متضاد عناصر میں امتیاز اور بھلائی کی طرف رغبت میں اس کی ترتیب سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ ان میں سب سے بڑی جلیل القدر نعمت حکمت کی نعمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا	وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیرِ کثیر کا خزانہ ملا۔

(البقرۃ : ۲۶۹)

حکمت کی نعمت شکر گزار بندوں کو ملتی ہے :

یہ حکمت وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے ہر ایک کو نہیں دی بلکہ وہ یہ نعمت اسی کو دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور یہ اسی کو ملتی ہے جو شکر ادا کرکے اور فطری ہدایت کی نعمتوں کو ٹھیک طرح استعمال کرکے اپنے آپ کو اس کا حق دار بنا لیتا ہے۔ فطری ہدایت اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو دی ہے، جیسا کہ فرمایا:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا	ہم نے اس کو راہ سمجھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے
وَإِمَّا كَفُورًا	والا بنے یا کفر کرنے والا۔
(الانسان : ۳)	

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس راستے پر کھڑا کر دیا ہے جو اس کو کمال تک پہنچانے والا ہے۔ لہٰذا انسانوں میں سے جو اس فطری ہدایت کو استعمال میں لائیں گے اور شکر ادا کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرمائے گا،

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى	اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی
(محمد : ۱۷)	اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی۔

اس کے برعکس جو لوگ فطری ہدایت کی نعمت کا جوا اتار پھینکیں گے اور اس پر عمل کرنے میں غلطی کریں گے تو وہ سیدھی راہ گم کر دیں گے اور بھٹک کر ہلاک ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا	رہے ثمود تو ہم نے ان کو ہدایت کی راہ دکھائی
الْعَمَى عَلَى الْهُدَى فَأَخَذَتْهُمْ	لیکن انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی
صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا	تو ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو بھی عذاب
كَانُوا يَكْسِبُونَ	ذلت کے کڑکے نے آدبوچا۔
(فصلت : ۱۷)	

پس ثمود نے جس طرح کی چیز پسند کی اسی کے مانند کا بدلہ ان کو دیکھنا پڑا، انہوں نے اپنی بری کمائی کا برا نتیجہ دیکھا کیونکہ نتیجہ عمل کے خلاف نہیں نکلا کرتا۔

باطل کے وجود کی بنیاد :

یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز سے اس کی ضد بھی پیدا کر لیتا ہے لیکن یہ وہ اپنی قدرت کی بدولت اپنی مخلوقات کی کسی مصلحت اور کسی حکمت کے لیے کرتا ہے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اعمال کی مماثل جزا کے قاعدے کے ساتھ ساتھ ہدایت کی راہیں کشادہ اور گمراہی کا شیرازہ منتشر کر دیا کیونکہ رحمت وسیع تر اور حق باقی رہنے والی چیز ہے۔ باطل کا وجود حق کے خادم اور سایہ کے طور پر ہے۔ اگر اس کی یہ حیثیت نہ ہوتی تو اس کا وجود ناپید ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَسِعَتْ رَحْمَتِي كُلَّ شَيْءٍ	میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔
(الاعراف : ۱۵۶)	

یہیں سے اللہ کے نام اللہ اور رحمان دونوں ہوئے۔ لہٰذا فرمایا گیا:

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ	کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام
أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ	سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام
(الاسراء : ۱۱۰)	اسی کے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ	بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس
فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ	کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو
(الانبیاء : ۱۸)	کے رہے گا۔

چنانچہ حق وہ ہے جس کا وجود واجب ہے، خواہ وہ قدیم ہو، جیسا کہ خداوند واحد و قہار ہے، خواہ وہ حادث ہو۔ پس اس نے اپنی رحمت کے تقاضے سے ہمیں پیدا بھی کیا اور نعمتیں بھی عطا کیں۔

نفس انسانی میں خیر اور شر کے دو پہلو :

خلق کے دو پہلو ہیں، ایک تاباں دوسرا تاریک، ایک خیر دوسرا شر۔ تاباں اور خیر پہلو رب کی طرف نسبت کے پہلو سے ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ	اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے۔
(السجدہ : ۷)	

اس پہلو سے خلق شر نہیں ہوتی۔ رہا دوسرا پہلو تو وہ نفس کی طرف نسبت سے ہوتا ہے۔ چونکہ وہ حق کا غیر ہے، اس کا یہ غیر ہونا شر ہے۔ لہٰذا شر سے بھاگنا واجب ہوا اور ہمیں عمومی طور پر خلق کے

شر سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی۔ فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ
(الفلق: ۱-۲)

کہہ، میں پناہ مانگتا ہوں نمودار کرنے والے خدا کی ہر اس شے کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے۔

شر کے وجود کی مصلحت:

اللہ تعالیٰ نور ہے جیسا آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) میں فرمایا۔ وہ نور کی پرورش کرتا ہے۔ اس نے تاریکی کو پیدا کیا تو کسی مصلحت سے۔ پس تاریکی کسی دوسری چیز کی خاطر پیدا کی گئی، جیسا کہ فرمایا:

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا
(الانعام: ۹۶)

وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی۔

معلوم ہوا کہ رات اپنی تاریکی کی خاطر نہیں بلکہ ایک مصلحت کی خاطر پیدا کی گئی۔ چونکہ اللہ خلق کا رب ہے لہٰذا وہ اس کو بڑھاتا ہے اور اس کی نشوونما کرتا ہے۔ رہی تاریکی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس خیر کے لیے مہلت دیتا ہے جو اس نے اس کے اندر رکھ دی ہے اگر وہ اس کو مٹانے میں جلدی کر کے اس کو مٹا دے تو وہ مصلحتیں بھی جو اس میں سے برآمد ہو رہی ہیں، مٹ جائیں گی اور اس طرح خیر کا وہ پہلو مٹ جائے گا جس کی وہ نشوونما فرماتا اور جس کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
(النحل: ۲۵)

وہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ خدا چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ
(الکہف: ۵۸)

اور تمہارا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا۔

اس سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ یہ مضمون یوں ادا ہوا ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
(فاطر: ۴۵)

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک معین مدت تک مہلت دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے عرصۂ حیات کا تعین اس لیے فرمایا ہے کہ ان کے اندر جو خیر مخفی ہے اس کو وہ ظاہر کر دے۔ یہ تمام تر عاقل و مختار نفس کی تربیت کے لیے ہے کیونکہ ایسے نفس کی مثال وہ پھول ہیں جو ان پودوں پر اگتے ہیں اور وہ جواہر ہیں جو ان پتھروں میں پائے جاتے ہیں۔ حکمت اس کی دولت ہے اور وہ اس دولت کے پالنے کے لیے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دینے میں جلدی کرنا چاہتا تو اس کو ہلاک کرتا اور اس طرح وہ ساری مخلوق کو بھی ہلاک کر دیتا جو انسان کی مدد کے لیے پیدا کی گئی۔ چونکہ اس نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ اپنی ہر مخلوق کو مہلت حیات دے کیونکہ وہ انسان کے نفع کے لیے ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
(البقرہ: ۲۹)

اس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا
(الشمس: ۱-۸)

شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے اور شاہد ہے آسمان اور جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو بچھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔

یہاں نفس اور اس کے اختیار کو آخری مقصد کے طور پر بیان کیا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کی تخلیق سب سے آخر میں اس وقت کی گئی جب دوسری تمام کائنات وجود میں آ چکی تھی۔ جس طرح خلق دو پہلو رکھتی ہے اسی طرح خداوند تعالیٰ نے اس کے اندر فلاح کے اسباب کو استعمال کرنے اور اس

کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ان الفاظ کے بعد خلقت میں تاریکی کے پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

حکمت رحمت کی تکمیل ہے :

پس نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت کا وجود لازمی ہے، یہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ وجود میں رحمت کا ہونا واجب ہے، اس کے بغیر وہ باطل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت ہی کے باعث خلق کا مقصود اور اس کی ہدایت رحمت ہی کو بنایا ہے۔ اس نے انسانوں پر انعام کیا اور اپنی رحمت کی تکمیل کی۔ اس کی تمام نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت حکمت ہے جو تمام امور کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اسی کے سہارے آسمان و زمین قائم ہیں۔ پس حکمت ہی آغاز، درمیان اور انجام ہے۔ یہی حقیقی رحمت، نعمت اور لذت ہے۔ یہی خواہشات کی ناپاکی کی طہارت اور ظلوم وجہول اور برائی پر اکسانے والے نفس کی آلودگیوں کا تزکیہ ہے۔ اسی کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اس نے انسانوں کو درجہ بدرجہ بلند کیا حتیٰ کہ علم لدنی کے حامل، کمال انسانی کی غایت، خاتم الرسل نبی اُمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس کو محکم کیا۔ اس نے حکمت کی تعلیم کو آپ کے ہاتھوں کامل کیا اور آپ کا نام احمد اور محمد رکھا۔ چونکہ جس کو سب سے بلند و برتر نعمت سے نوازا جائے وہ رب کی انتہائی حمد کرتا ہے لہٰذا حضور اسی لحاظ سے محمد ہو گئے۔

خلاصہ مباحث :

حکمت کے ان مباحث سے میں نے جو بات واضح کرنی چاہی ہے، اپنے قارئین کو سمجھانے کی غرض سے میں اس کے نکات دوسرے قالب میں بیان کرتا ہوں۔ یہ نکات اس طرح ہیں:

۱۔ حکمت کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی اصل کیا ہے اور فرع کیا؟

۲۔ مرتبہ اور زمانہ کے لحاظ سے اس کا مقام کیا ہے؟

۳۔ عقائد اور اعمال کی صحت کا دارومدار حکمت پر ہے۔

۴۔ حکمت عقائد اور اعمال کو مرتب کر دیتی ہے، ہر چیز کو اس کا جائز مقام دیتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ واضح کرتی ہے۔ لہٰذا یہ تمام علوم اور اعمال کا نظام اور ان کو وجود میں لانے کا ذریعہ ہے۔ حکمت کے بغیر دین کا زیادہ تر حصہ غائب ہو جاتا ہے بلکہ خالی صورت کے سوا اس میں کچھ نہیں بچتا۔ حتیٰ کہ کبھی وہ اس طرح پارہ پارہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی جس پر دین کے نام کا اطلاق

باقی ص۴۸ پر

علم اور ذرائع علم

[یہ تقریر انجمن فاضلین ادارۂ تعلیم، جامعہ پنجاب کے ایک اجلاس میں ۱۹۶۶ء میں کی گئی]

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اصل چیز جو انسان کو حیوانات سے ممیز کرتی ہے، وہ علم و ادراک ہے۔ جہاں تک دوسری خصوصیات و صفات کا تعلق ہے۔ مثلاً کھانے پینے میں، بھاگنے دوڑنے میں، توالد و تناسل میں، حیوانات نہ صرف انسان کے شریک و سہیم ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان صفات میں وہ انسان پر مختلف اعتبارات سے بالاتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن علم و ادراک کی صفت انسان کے اندر ایک ایسی صفت ہے جس کی بدولت انسان نہ صرف تمام حیوانات پر حکمران ہے بلکہ پہاڑوں اور سمندروں کو تسخیر کرتا ہے، ہواؤں پر حکومت کرتا ہے۔ ستاروں پر کمند ڈالتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو فرشتوں پر بھی بازی لے گیا ہے۔

اسی وجہ سے دنیا کی قدیم ترین سچائیوں میں سے ارسطو کی یہ بات بھی ہے کہ "انسان حیوان ناطق ہے"۔ ناطق کے معنی آپ جانتے ہیں کہ "دریابندہ معقولات" کے ہیں یعنی انسان صرف محسوسات ہی کا علم نہیں رکھتا بلکہ معقولات کی دریافت بھی کرتا ہے اور اس کی یہی صفت ہے جو اسے حیوانات سے الگ کرتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو انسان بھی حیوانات کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم کا حیوان ہوتا اور اگر سب سے نہیں تو بہت سی قسموں سے تو ضرور فروتر ہوتا۔

حضرات۔ انسان کی یہی جبلت ہے جس کی وجہ سے انسان کا بچہ ابھی ماں کی گود ہی میں ہوتا ہے کہ ہر چیز سے متعلق کیا، کیوں اور کس طرح کے سوالات کی بھرمار سے ماں اور باپ کو تنگ کر دیتا ہے۔ اسی جبلت کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے قدرت نے انسان کو عقل سے نوازا ہے جو انسان کی

تمام خصوصیات میں سے اعلیٰ خصوصیت اور اس کے تمام کارناموں اور اس کی کامرانیوں کا سرچشمہ ہے ۔

جبلّی اور فطری تقاضا ہونے کی وجہ سے ہر انسان کے اندر علم کی طلب لازماً پائی جاتی ہے لیکن جس طرح ہر فطری طلب موانع و مشکلات اور ماحول کی مزاحمتوں کی وجہ سے دب جاتی ہے یا غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح یہ طلب بھی بہت سے لوگوں کے اندر مغلوب یا پراگندہ ہو جاتی ہے ۔ لیکن یہ انسان کے اندر یہ اتنی شدید کہ یہ مُردہ کبھی نہیں ہوتی اور اس دنیا میں بے شمار انسان ایسے گزرے ہیں جن کے اندر مزاحمتوں کے علی الرغم یہ داعیہ اس زور سے اُبھرا ہے کہ انہوں نے کسی مزاحمت کی بھی پروا نہیں کی ہے اور اس راہ میں ایسی قربانیاں دی ہیں کہ انسانیت ان پر ہمیشہ فخر کرے گی اور درحقیقت ایسے ہی جانبازوں کے کارنامے ہیں جن سے آج نہ صرف علم و فن کے بازار کی رونق ہے بلکہ دنیا کی ساری بہار انہی کی لائی ہوئی ہے ۔

حضرات میری اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ علم انسان کی سب سے اعلیٰ طلب ہے اور اس طلب کے بروئے کار آنے کا ذریعہ اُس کی عقل ہے ۔ انسان کی ساری فتوحات اس کے دم قدم سے ہیں۔ یہ نہ ہو تو یہ دُنیا بالکل تاریک ہو جائے ۔ اس وجہ سے میں ان فلسفیوں سے متفق نہیں جو عقل کی کج اندیشیوں اور گمراہیوں کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ عقل انسان کی رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ اس کو گمراہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کے ساتھ لگا دی ہے ۔ عقل کو اس طرح مطعون کرنا میرے نزدیک ایک قسم کا مغالطہ ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل بہت حفاظت اور بڑی تربیت کی محتاج ہے ۔ حفاظت سے میرا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کا تمام شرف چونکہ اسی پر منحصر ہے، اس وجہ سے سب سے بڑی ضرورت انسانیت کی یہ ہے کہ انسان کا یہ جوہر کسی غلط ہدف پر ضائع نہ ہو بلکہ اسی مقصد پر صرف ہو جس مقصد کے لیے قدرت نے اس کو انسان کے اندر ودیعت کیا ہے ۔

تربیت سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں کہ یہ برابر ترقی کرتی رہے اور اس پر کبھی جمود اور اندھی تقلید کا زنگ لگنے نہ پائے ۔ اس مقصد کے لئے دنیا میں اس قسم کے اداروں کا وجود ہوا جن میں سے ایک ادارے میں آج مجھے یہ تقریر کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے ۔ میرے نزدیک ان اداروں کا اصل مقصد کتابوں کی تعلیم و تدریس نہیں بلکہ عقل کی ایسی تربیت ہے کہ یہ حصولِ علم کی راہ میں ہمیشہ سرگرم رہ سکے ۔

حضرات ۔ لیکن عقل کی اس فضیلت کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیئے کہ عقل نہ تو بے خطا چیز ہے اور نہ اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جس طرح مادیات و محسوسات کے عالم میں اپنی جولانیاں دکھاتی ہے اسی طرح ان اعلیٰ اقدار و حقائق کی جستجو میں بھی تگ و دو کر سکتی ہے ۔ جو محسوسات

و مادیات سے ماورا ہیں ۔ حالانکہ وہی اقدار و حقائق ہیں جن سے انسانی زندگی کو ابدیت اور غیر فانی ہونے کا مقام حاصل ہوتا ہے ۔ اگر انسان ان حقائق سے بے خبر رہے تو خواہ مالی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کرے، اس کو ابدیت کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہو سکتا ۔

عقلِ انسانی کی اس کمی کو پُورا کرنے کے لیے قدرت نے انسان کو ایک اور ذریعہ علم بھی عطا فرمایا ہے ۔ یہ ذریعہ وحی کا ذریعہ ہے ۔ وحی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے آئی ہے ۔ جن کا علم بے خطا بھی ہے اور جو ان حقائق و اقدار پر مشتمل بھی ہے جو محسوسات و مادیات سے ماورا ہیں ۔ یہ علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے دیا ہے کہ انسان اس عالمِ آب و گل کا اسیر بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس زندگی کے بعد ابدی زندگی کی خوشیوں اور لذتوں کو بھی حاصل کر سکے ۔

وحی کے ذریعے سے ہمیں جو علم حاصل ہوا ہے نہ وہ عقل کے خلاف ہے نہ وہ اس دنیا کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہے ، بلکہ وہ تمام تر عقل و فطرت ہی کے تقاضوں پر مبنی ہے اور اس کا مقصد ہماری اس دنیاوی زندگی کی ایسی تنظیم ہے کہ یہ زندگی ہماری ابدی زندگی کا دیباچہ اور اس کی تمہید بن جائے اور ہم یہاں اپنی زندگی آخری زندگی کی صلاح و فلاح کو پیش نظر رکھ کر گزاریں ۔

آپ اگر علم وحی پر ایک شائق علم طالب علم کی طرح کسی بدگمانی کے بغیر غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ ہماری عقل کو معطل نہیں کرتا بلکہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے غور و فکر اور اپنی تحقیق و جستجو کو صرف اس عالمِ رنگ و بُو ہی تک محدود نہ رکھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان ظواہر کے پیچھے جو حقائق ہیں ان کو بھی دیکھے اور سمجھے ۔ یہ ہمیں اس بات کی ترغیب نہیں دیتا کہ ہم اس دنیا کے معاملات و مسائل کو نظر انداز کر دیں بلکہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم صحیفۂ کائنات کے صرف اسی ایک ورق کے فکر و مطالعہ پر قانع نہ ہو جائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے بلکہ اس صحیفہ کے ان اوراق کو بھی پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں جو اگرچہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہیں لیکن ہمارے دل اور ہماری آنکھوں کے لیے وہ بھی کھُلے ہوئے ہیں ۔

اس وجہ سے میں علم کے ان دونوں ذرائع عقل اور وحی کو یکساں اہمیت دیتا ہوں اور ان کے درمیان کسی نزاع کا قائل نہیں ہوں ۔ جو لوگ ان کے درمیان نزاع کے قائل ہیں اور عقل کی حمایت میں وحی کو یا وحی کی حمایت میں عقل کو مطعون کرتے ہیں میں اس کو ان کی کم نگاہی پر محمول کرتا ہوں ۔ جس طرح عقل استدلال سے کام لیتی ہے اسی طرح وحی بھی آفاق و انفس کی نشانیوں سے استدلال کرتی ہے اور اس استدلال میں وہ تمام تر عقل ہی کے

کلیات استعمال کرتی ہے اور عقل کی جولانیوں کے لیے ایک غیر محدود میدان فراہم کرتی ہے۔ پس علم کی صحیح ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم وحی کی روشنی سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھائیں ورنہ عقل اور سائنس کی مدد سے آج جو فتوحات انسان حاصل کر رہا ہے، یہ ان کے لیے نفع رساں ہونے کے بجائے تباہی کا باعث بن جائیں گی۔ موجودہ دور کے انسان نے سائنس کے زور سے اسلحہ تو بے پناہ ایجاد کر لیے لیکن وحی کی رہنمائی سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے ظرف کے اندر وہ وسعت اور آفاقیت پیدا نہ کر سکا جو ان اسلحہ کے صحیح استعمال کے لیے ناگزیر ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کو اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا اور اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

بقیہ: حکمتِ قرآن (۳) — شکرِ نعمت کا نتیجہ — حکمت

کیا جا سکے، چنانچہ دین کی جگہ انکار اور ایمان کی جگہ کفر لے لیتا ہے۔

۵۔ اس کتاب میں ہمارے پیشِ نظر جو اہم مطالب ہیں ان میں ہم عقائد کی ترتیب اور ان کی باہمی نسبت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اعمال کی وضاحت بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ عمل کا طریقہ ہموار ہو اور عقائد صحیح اور محکم ہوں۔ ہمارے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو حکمت لے کر آئے اور جس کی آپ نے تعلیم دی، اس کا مقصودِ اصلی یہی تھا۔

تالیفاتِ امام حمیدالدین فراہیؒ

	پیسے روپے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	۰۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے	۵-۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن: (مکمل سیٹ: ۹ جلد)	۹۰۰-۰۰
: فی جلد	۱۰۰-۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن	۰۰-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین	۰۰-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست	۰۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام	۴-۰۰
۷۔ تنقیدات	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس: جلد اوّل	۴۵-۰۰
: جلد دوم	۰۰-۰۰
۱۰۔ مبادیٔ تدبرِ حدیث	۰۰-۰۰
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار	۳۲-۰۰
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۳۶-۰۰
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید	۰۰-۰۰
۱۴۔ حقیقتِ نماز	۱۸-۰۰
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ	۱۸-۰۰

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور — ۵۴۶۰۶ — پاکستان۔ فون: ۲۷۳۴۳۷۷